فہرست

شذرات	استحکام پاکستان	منظور الحسن	۲
	ہندوستانی انتخابات اور پاکستان	ریحان احمد یوسفی	٦
قرآنیات	آل عمران (۳: ۲٦۔۳۲)	جاوید احمد غامدی	۹
معارف نبوی	ایک صحابی کی اندیشہ ناکی ۔عہد الست کا مقام	طالب محسن	۱۵
دین و دانش	قانون عبادات (۱۲)	جاوید احمد غامدی	۲۱
	غیرت کا قتل	طالب محسن	۳۹
نقد و نظر	''تصویر کا مسئلہ''۔۔۔۔ ''محدث'' کے اعتراضات کا جائزہ	محمد رفیع مفتی	۴۳
ادبیات	سورۂ ماعون کی منظوم ترجمانی	مرزا آصف رسول	۵۴

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظور الحسن

استحکام پاکستان

۱۹۴۷ء میں ہم نے سوچا تھا کہ ہم کرۂ ارض پر ایک ایسی سلطنت قائم کر رہے ہیں جہاں اسلام اپنے پورے فلسفے اور قانون کے ساتھ نافذ العمل ہو گا۔ چشم عالم ایک مرتبہ پھر اس عدل اجتماعی کا نظارہ کرے گی جو چودہ صدیاں پہلے خلافت راشدہ کی صورت میں ظہور پزیر ہوا تھا۔ اس کا وجود ملت اسلامیہ کے لیے مرکزی ادارے کا کردار ادا کرے گا اور غیر مسلم دنیا کے لیے اسلام کی مشہود دعوت قرار پائے گا۔ اس کے حدود میں مسلمانوں کی ترقی کی راہیں کسی دوسری قوم کے تعصب سے مسدود نہیں ہوں گی۔ وہ باہم متحد ہو کر اسے اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیں گے اور دیگر مسلمانان عالم کے لیے سہارے اور تعاون کا باعث ہوں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم ایک ایسی ریاست تشکیل دے رہے ہیں جو دور جدید میں فلاحی ریاست کے تمام تر تصورات کی آئینہ دار ہو گی۔ جہاں تفریق و امتیاز کے بغیر شہریوں کو ان کے حقوق میسر ہوں گے اور لوگ یکساں طور پر تعلیم، روزگار، صحت اور امن عامہ کی سہولتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔ ہمارا تصور تھا کہ ہم ایک ایسا ملک معرض وجود میں لا رہے ہیں جس کا نظم سیاسی جمہوری اقدار پر مبنی ہو گا۔ اس کے عوام اپنا اجتماعی نظام خود تشکیل دیں گے اور انھیں اس میں تبدیلی کرنے اور اپنے حکمرانوں کے تقرر و تنزل کا پورا اختیار حاصل ہو گا۔

آج پاکستان کو قائم ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کا وجود سلامت ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے خواب آج بھی تشنۂ تعبیر ہیں۔ اسلام کا عدل اجتماعی اور خلافت راشدہ تو افلاک کی باتیں ہیں، ہم ان ارضی اخلاقیات تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکے جو دنیا میں متفق علیہ ہیں اور جن پر اسلام سے نابلد اقوام بھی صدیوں سے عمل پیرا ہیں۔ یہ سلطنت اسلام کی تجربہ گاہ اور پھر اس کا مشہود نمونہ تو کیا بنتی، اسلام کی حیثیت عرفی کو مجروح کرنے کا باعث ضرور ہوئی ہے۔ اس کے مکینوں نے اپنے قول و عمل سے اسلام کا جو تعارف پیش کیا ہے، اس کی روشنی میں اہل دنیا اسے ایک متشدد، غیر عقلی، جذباتی اور عصر حاضر سے غیر ہم آہنگ مذہب تصور کرتے ہیں۔ فلاحی ریاست کے تمام تصورات بکھر چکے

ہیں۔ غربت اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ ملکی معیشت دن بہ دن رو بہ زوال ہے۔ بیشتر آبادی کے لیے دو وقت کے کھانے کا حصول مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیمی پس ماندگی کا یہ عالم ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد ملازمت کا حصول بن گیا ہے۔ درس گاہوں کی حالت یہ ہے کہ فلسفہ، ادب، تاریخ، عمرانیات، اقتصادیات، ریاضی، سائنس، آرٹ اور دیگر علوم وفنون کے وہ نصابات جن سے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کئی عشرے پہلے گزر کر انھیں متروک قرار دے چکی ہیں، وہ ان میں کسب فیض کا ذریعہ ہیں۔ لوگوں کی اکثریت کو صحت کی ابتدائی ضرورتیں بھی میسر نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ فلاحی ریاست کے حوالے سے ہمارا سفر آج بھی اتنا ہی باقی ہے جتنا آج سے پچاس سال پہلے تھا۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ہم شاید چند دنوں کے لیے بھی اس کا تجربہ نہیں کر سکے۔ نیچے سے لے کر اوپر تک ہماری جمہوری سیاست محض مفادات کی سیاست واقع ہوئی ہے۔

یہ حال ہے جو ہمارے خوابوں اور ہمارے تصورات کا ہوا ہے۔ ہمارے اجتماعی وجود کی یہ حالت اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ، یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کا سبب کیا ہے؟ کیا یہاں افرادی وسائل کی کمی ہے، کیا یہاں بے صلاحیت لوگ بستے ہیں، کیا یہاں کے لوگوں کو نفاذ اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، کیا یہاں کے باشندے اپنی اور ملک کی ترقی کی خواہش سے محروم ہیں، کیا یہاں کے شہری نظم سیاسی کو اپنی منشا کے مطابق چلانے کی تمنا نہیں رکھتے؟ یا پھر یہ خطۂ ارضی آفات سماوی کا شکار ہے، یا اس کی سرزمین قدرتی وسائل سے خالی ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں ہر شخص کہے گا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ملک افرادی وسائل سے مالا مال ہے۔ قدرتی وسائل کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس سرزمین میں زراعت اور معدنیات کے حوالے سے ایسا تنوع اور تناسب پایا جاتا ہے کہ دنیا کے کم ممالک ایسی تقسیم کے حامل ہیں۔ اس کے باسی صلاحیت اور جاں فشانی میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلسل جدوجہد سے ایک ایسے ملک کو قائم کیا جسے دنیا ناممکن قرار دے رہی تھی۔ ملک وملت کی بقا کے لیے جب بھی کسی نے صدا لگائی ہے، اس کے افراد نے اپنی جانیں تک پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ جمہوریت کے نعرے پر ہمیشہ لبیک کہا ہے۔ اسلام سے محبت کا یہ عالم رہا ہے کہ اگر کسی طالع آزما نے بھی اسلام کا نعرہ لگایا تو اس پر بھی لبیک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔

اگر معاملہ یہ ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ۵۷ برس گزرنے کے باوجود ہم منزل تک رسائی تو کیا حاصل کرتے، نشانات منزل ہی کھو بیٹھے ہیں۔ اس تمام صورت حال کا صرف ایک سبب ہے اور وہ دینی اور دنیوی امور میں ہماری جہالت ہے۔

ہم اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ نہیں بنا سکے تو اس کی وجہ دین کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ اس جہالت کا عالم یہ ہے کہ ہمارے عوام کا تصور دین مخصوص مکاتب فکر کی فقہی آرا کی پیروی تک محدود ہے۔ کہیں کلمات نماز کے بلند آہنگ یا کم آہنگ ہونے کا مسئلہ ہے، کہیں ازار کے ٹخنوں سے اوپر یا نیچے ہونے کا معاملہ ہے، کہیں داڑھی کے لمبا یا چھوٹا ہونے کا سوال ہے، کہیں عمامے اور ٹوپی کی جنگ ہے۔ خواص کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی غلط تعبیرات سامنے آنے کی وجہ سے اسے ایک

قصۂ پارینہ سمجھ کر دور جدید کے تقاضوں سے غیر ہم آہنگ قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک علماے دین کا تعلق ہے تو ان کی اکثریت لوگوں کو سرگرم جنگ رکھنے پر مصر ہے۔ انھوں نے اس دوران میں کبھی اس کے لیے کوشش نہیں کی کہ لوگوں کو دین کے حقیقی شعور سے آگاہ کریں، ان کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کریں اور انھیں حالات کے لحاظ سے حکمت عملی ترتیب دینے کی ترغیب دیں۔ اس زمانے میں بالخصوص ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اسلام کے بارے میں جدید ذہن کے سوالات کا جائزہ لیتے اور عصر حاضر کے اسلوب میں ان کے تسلی بخش جوابات مرتب کرتے۔ المیہ یہ ہے کہ انھوں نے اس میدان میں علمی و فکری کام کرنے کے بجائے اپنی تمام تر توجہ سیاست کی حریفانہ کشمکش اور معاندانہ قوتوں کے خلاف جذباتی فضا قائم کرنے پر مرتکز رکھی ہے۔

اگر ہم اسے ایک فلاحی ریاست نہیں بنا سکے تو اس کی وجہ دنیوی امور کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ اپنے افراد کی عمومی تعلیم کے بارے میں ہم نے ہمیشہ غفلت اور بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے تمام طبقات بلا استثنا جہالت کا شکار ہیں۔ فلاحی ریاست کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ معاشرے کا اجتماعی نظام عادل، شفاف اور زندگی کی سہولتوں سے آراستہ ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ہم نے کبھی منصوبہ بندی نہیں کی۔ معاشرے کی ترقی کے لیے کن عوامل کی ضرورت ہوتی ہے، قانون پسندی کی کیا اہمیت ہے، اعلیٰ انسانی اقدار کس طرح اداروں میں ڈھلتی ہیں، رفاہی ادارے کس طریقے سے خدمت انجام دیتے ہیں، شہریوں کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں، ارباب حکومت کو کیا فرائض انجام دینے ہوتے ہیں، صحت، تعلیم اور روزگار کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے حکومت کو کیا منصوبہ بندی کرنا ہوتی ہے اور عوام کیسے اس عمل میں شریک ہوتے ہیں، امن عامہ کے مسائل کو کیسے حل کیا جاتا ہے، ظلم و عدوان کے خاتمے اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے کیسے لائحۂ عمل تشکیل دیا جاتا ہے؟ یہ مسائل ہمارے فکر و عمل کا کبھی حصہ نہیں بن سکے۔ اس زمانے میں کسی قوم کی مادی ترقی کا انحصار سرتاسر اس بات پر ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ دفاع، صنعت، زراعت اور رسل و رسائل کے معاملات میں سائنس اور ٹیکنالوجی ہی کی بنیاد پر ترقی کی جا سکتی ہے۔ مگر ہماری حالت اس میدان میں نہایت ابتر ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہماری غربت کا اصل سبب جدید سائنسی علوم سے بے اعتنائی ہے۔ فلاحی ریاست کا تصور امن عامہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس کے قیام کے لیے ضروری تھا کہ ہم عام اخلاقیات کے شعور سے بہرہ مند ہوں۔ ہماری تربیت ہونی چاہیے تھی کہ ایک شہری کی حیثیت سے ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں، دوسروں کے حقوق کس طرح ادا کیے جاتے ہیں، قانون کی پاس داری کے فوائد اور قانون شکنی کے کیا نقصانات ہیں، دھوکا، فریب، عناد، ہٹ دھرمی اور حق تلفی سے کس طرح انسانی شخصیات مسخ ہوتی اور پورے معاشرے کے لیے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ ان پہلوؤں سے ہم آج تک نہ اپنی تربیت کر سکے اور نہ اس مقصد کے لیے کوئی لائحۂ عمل تشکیل دے سکے ہیں۔

اگر ہم یہاں جمہوری اقدار کو مستحکم نہیں کر سکے تو اس کی وجہ سیاسی معاملات کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ ہمارے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عوام کی اکثریت سیاسی شعور سے بے گانہ ہے۔ جمہوریت عوام کی سیاسی عمل میں بھر پور شرکت کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے افراد باہمی مشاورت سے اپنی ضرورتوں کا تعین کرتے، انھیں پورا کرنے کے لیے لائحۂ عمل تشکیل دیتے، اپنی تنظیم کرتے، تقسیم کار کے اصول پر اپنی ذمہ داریاں بانٹتے، اس مقصد کے لیے ادارے اور انجمنیں تشکیل دیتے اور پوری تن دہی کے ساتھ ملکی تعمیر میں سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ قوم کا ہر فرد اس کام میں پورے شعور کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا معاملہ یہ ہے کار پرداز عناصر عوام کو فریب دیتے اور عوام بڑی آسانی سے ان کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ جس فرد یا گروہ کے ہاتھ میں اقتدار آتا ہے، وہ اس پر بالجبر قابض رہنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے جمہوری اداروں کی پامالی کی پروا بھی نہیں کرتا۔ ایسے موقعوں پر عوام نہ موثر احتجاج کر پاتے اور نہ تبدیلی حالات کے لیے صحیح خطوط پر کوئی جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں نکلتا کہ جمہوری ادارے بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں اور ملک پر سیاسی عدم استحکام کی فضا طاری رہتی ہے۔

اس تناظر میں ہم سمجھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے واحد راستہ تعلیم ہے۔ جب تک ہم دینی و دنیوی اعتبار سے اپنی جہالت سے چھٹکارا نہیں پا لیتے اور اس حقیقت کا ادراک نہیں کر لیتے کہ موجودہ زمانے میں تعلیم و تعلم ہی سے ترقی کے منازل طے کیے جا سکتے ہیں، اس وقت تک ہمارا یہ خواب، خواب ہی رہے گا۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

ہندوستانی انتخابات اور پاکستان

دورِ جدید میں انسانی حقوق، فرد کی آزادی اور جمہوریت وغیرہ جیسی اقدار کو ایک غیر معمولی تقدس حاصل ہو گیا ہے۔ ان شعبوں میں بہتر کارکردگی دکھانے والی اقوام ہی دنیا میں مہذب کہلاتی ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان کا ریکارڈ باقی شعبوں کے معاملے میں جیسا بھی ہو، کم از کم جمہوریت کے شعبے میں، اس کی کارکردگی بلاشبہ قابل تعریف رہی ہے۔ اس کا ایک نمونہ ہندوستان کے حالیہ انتخابات میں دنیا کے سامنے آیا۔ ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ اس میں انتخابات کا مرحلہ بڑا طویل اور دشوار گزار ہوتا ہے، مگر انتخابی عمل، نتائج، انتقال اقتدار اور نئی حکومت کی تشکیل کے مراحل جس طرح بخیر وخوبی طے ہوئے اور اس پورے عمل میں جمہوری روایات سے وابستگی اور اصول پسندی کا جو مظاہرہ کیا گیا، اس کو دنیا بھر نے تحسین کی نگاہوں سے دیکھا۔

ہمارے ہاں بھی ان انتخابات اور ان کے نتائج پر تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ان تبصروں کا سب سے نمایاں پہلو پاکستان کی سیاسی صورت حال کا ہندوستان کے سیاسی حالات سے تقابل ہے۔ بالخصوص ان کے قائدین نے اس موقع پر اقتدار کے بجائے اصولوں کو ترجیح دینے اور ذاتی مفاد پر ملکی مفاد کو مقدم رکھنے کے جس کردار کا مظاہرہ کیا، اس آئینے میں ہمارے سیاسی رہنماؤں کا چہرہ جو پہلے بھی بہت خوش نما نہ تھا، مزید دھندلا ہو کر سامنے آیا ہے۔

جمہوریت کے معاملے میں ہمارے حال اور ماضی قریب وبعید پر لگے سیاہ دھبے اس طرح واضح ہیں کہ ان کی شرح و وضاحت کے لیے صفحات سیاہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک سب سے اہم بات یہ ہے کہ مستقبل میں جمہوریت کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں موجودہ حکومت، عملیت پسندی کے نام پر جو روایات قائم کر رہی ہے، وہ کسی طرح بھی قابل تحسین نہیں ہیں۔ ہم پوری خیر خواہی کے جذبے سے حکومتی حلقوں کو یہ باور کرانا چاہیں گے کہ ان روایات سے کوئی خیر جنم نہیں لے گا۔ اس سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس طرح ملک میں کوئی بے غرض سیاسی قیادت جنم

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

نہیں لے گی۔ اس طرح ملک میں جمہوریت کے تسلسل کو یقینی نہیں بنایا جا سکتا۔

بلاشبہ خارجی اور معاشی محاذ پر حکومت کی کارکردگی بہتر رہی ہے۔ اس کی تحسین بھی کی جانی چاہیے، مگر اصلاً یہ حکومت کے ادارے کی نہیں، بلکہ کچھ افراد کی ذاتی صلاحیتوں اور اتفاقی طور پر جنم لینے والے بعض بین الاقوامی حالات کا نتیجہ ہے۔ قوموں کی کامیابی کا انحصار حالات وافراد پر نہیں، بلکہ اداروں اور نظام پر ہوتا ہے۔ حالات بدل جاتے ہیں۔ افراد رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد قوم کی نیا پھر اسی منجدھار میں ڈولنے لگتی ہے جہاں سے نکالنے کے لیے کوئی حوصلہ مند جمہوریت کی بساط لپیٹ دیتا ہے۔ یہ اداروں کا استحکام اور اعلیٰ روایات کا فروغ ہے جو سیاسی تسلسل اور نتیجۃً ملکی ترقی و استحکام کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر ملک کی کوئی خدمت کرنی ہے تو اسی کے لیے کام کیجیے۔ دنیا کی نگاہوں میں باعزت مقام اور زبردست معاشی ترقی کی نوید قوم پہلے بھی سن چکی ہے اور اسے ابھی نہیں بھولی جو اس سب کے بعد رونما ہوا۔

حزب اختلاف میں موجود جماعتیں بھی ہمارے سیاسی عدم استحکام کو پیدا کرنے کا سبب رہی ہیں۔ نوے کی دہائی میں اپوزیشن کی دو بڑی جماعتوں کو ایک سے زیادہ دفعہ اقتدار میں آنے کا موقع ملا، مگر ان کی عدم برداشت، جمہوری روایات سے عدم وابستگی اور مفاد پرستی نے عوام کو سیاسی عمل سے مایوس کر دیا۔ اس پر مستزاد وہ بدانتظامی اور بدعنوانی تھی جس کے چرچے دنیا بھر میں عام ہو گئے۔ چنانچہ جب سیاسی نظام کی بساط لپیٹی گئی تو عوام کی طرف سے کوئی مزاحمت سامنے نہ آئی۔ ضروری ہے کہ آج وہ اقتدار سے دور ہیں تو ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ان کا وہ کیا طرز عمل تھا جس نے یہ صورت حال پیدا کی۔ وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ سہی ادراک ہی کر لیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں خیر کی کوئی صورت پیدا ہو سکے گی۔

ہمارے سیاسی المیوں کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں سیاست کے شعبے میں ان جاگیرداروں کا تسلط رہا ہے جو محض اپنے رئیسانہ شوق کی تکمیل اور مفادات کے تحفظ کے لیے میدانِ سیاست میں اترے۔ ایسے لوگوں سے کسی اصول پرستی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ جاگیرداری کا زور ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ لوگ زرعی اصلاحات نہ بھی ہونے دیں تب بھی شہری آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر عوام الناس اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ووٹ کی طاقت کو درست طور پر استعمال کریں تو آنے والے دنوں میں حالات بتدریج بہتر ہوتے چلے جائیں گے۔ ہمارے ہاں سیاست سے مایوس ہو کر انتخابات کے موقع پر گھر بیٹھنے کی روش بلاشبہ بہت بڑی غلطی ہے۔ ووٹ ڈالنا ایک مذہبی ذمہ داری ہے۔ یہ حق کی شہادت ہے جو اگر مانگی جاتی ہے تو اس سے مفر ممکن نہیں رہتا۔ یہ شہادت اگر بلا کسی تعصب اور ذاتی مفاد سے اٹھ کر ادا کی جائے گی تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ اس کے صلے میں ایک بہتر قیادت سامنے آ جائے گی۔

آج بلاشبہ ہماری سیاسی صورت حال ناقابل رشک ہے، مگر سب سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ہماری قوم کے باشعور اور فہمیدہ عناصر نے اس صورت حال کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان کے ان انتخابات نے ہمارے سوچنے والے اذہان پر جو اثرات مرتب کیے ہیں، ان کے نتیجے میں یقیناً ہمارے اندر جمہوریت کا شعور پختہ

ہوگا اور خود کو بہتر بنانے کی خواہش مضبوط ہوگی۔ جس کے نتیجے میں مستقبل قریب میں نہ سہی، مگر مستقبل بعید میں پاکستان میں بھی ایک قابل رشک صورت حال، ان شاء اللہ، جنم لے گی۔ جمہوریت کے نتیجے میں بننے والا پاکستان، جمہوریت کے راستے پر چل کر ہی ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۷)

(گزشتہ سے پیوستہ)

قُلِ: اللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ، تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ، وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ، وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ، بِیَدِكَ الْخَیْرُ، اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ، وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ، وَتُخْرِجُ

(اِن کا عہد تمام ہوا، اِس لیے اب) تم دعا کرو کہ اے اللہ، بادشاہی کے مالک، تو جس کو چاہے، بادشاہی دے اور جس سے چاہے، یہ بادشاہی چھین لے؛ اور جس کو چاہے، عزت دے اور جس کو چاہے، ذلیل کر دے۔ تمام خیر تیرے ہی اختیار میں ہے۔ بے شک، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۴۷]۔ (ہم

---

[۴۷] یہ بظاہر ایک دعا ہے، لیکن غور کیجیے تو اس میں بنی اسمٰعیل کے لیے ایک عظیم بشارت چھپی ہوئی ہے، اس لیے کہ یہ دعا صاف اشارہ کر رہی ہے کہ تمام خیر کے مالک، پروردگار عالم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دنیا کی بادشاہی بنی اسمٰعیل کو دے دی جائے گی اور بنی اسرائیل کی کوئی مخالفت بھی اس فیصلے کو تبدیل نہ کر سکے گی۔ ان کے لیے ذلت ہی ذلت ہے۔ چنانچہ وہ اس دنیا میں اب اگر رہیں گے تو بنی اسمٰعیل کے محکوم ہو کر رہیں گے، اس کے سوا جینے کی کوئی دوسری صورت ان کے لیے باقی نہیں رہی۔

پھر یہی نہیں، اس بشارت کے ساتھ ایک عظیم نصیحت بھی اس میں پوشیدہ ہے کہ بنی اسمٰعیل اس بادشاہی کو اپنے استحقاق کا

الْـحَـىَّ مِنَ الْمَيِّتِ، وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ، وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

لَايَتَّـخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ، فَـلَيْـسَ مِـنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ، اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً، وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ

جانتے ہیں کہ) تو رات کو دن میں اور دن کو رات میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور (جانتے ہیں کہ) تو مردے سے زندہ کو اور زندہ سے مردے کو نکالتا ہے[۴۸]۔ اور جس کو چاہتا ہے، بے حساب روزی عطا فرماتا ہے[۴۹]۔ ۲۶۔ ۲۷

(یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اِن اہل کتاب کے لیے عنقریب صادر ہو جائے گا، اِس لیے) ایمان والے اب مسلمانوں کو چھوڑ کر اِن منکروں کو اپنا دوست نہ بنائیں[۵۰] اور (یاد رکھیں کہ) جو یہ کریں گے، اللہ کو اُن سے

کرشمہ سمجھ کر فخر وغرور کے ساتھ قبول نہ کریں، بلکہ تواضع، فروتنی اور احساس عبدیت کے ساتھ قبول کریں، اس لیے کہ تمام خیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور یہ محض اس کی عنایت ہے کہ اس نے دنیا کی سب قوموں میں اس کا سزاوار انھیں قرار دیا ہے۔

[۴۸] یہ اسی بات پر جو اوپر بیان ہوئی ہے، آفاق کی شہادت ہے کہ لوگ اسے کوئی دور کی چیز نہ سمجھیں، جس طرح دن سے رات، رات سے دن، اور موت سے زندگی اور زندگی سے موت نمودار ہوتی رہتی ہے، اسی طرح قوموں کے لیے عزل و نصب، عزت وذلت اور موت وحیات کے فیصلے بھی صادر ہوتے رہتے ہیں۔ بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کی موت وحیات کی طرف جو اشارہ اس تمثیل میں کیا گیا ہے، اس کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس طرح فرمائی ہے:

’’حضرت ابراہیم نے جو پودا فلسطین کی سرسبز وشاداب زمین میں لگایا تھا، اب وہ سوکھ چکا تھا اور جیسا کہ حضرت یحییٰ نے فرمایا، اس کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے جو پودا عرب کی خشک اور بنجر زمین میں لگایا تھا، اور جو مرجھایا ہوا پڑا تھا، اب اس میں شگوفے نکل رہے تھے اور جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا: وہ ایک تناور درخت بن کر ایک عالم کو اپنے سایے کی پناہ میں لینے والا تھا۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/۶۵)

[۴۹] یعنی اتنا دیتا ہے کہ اس کی کوئی حد ونہایت نہیں رہتی اور وہاں سے دیتا ہے، جہاں سے کسی کو اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

[۵۰] یہ ان مسلمانوں کے لیے تنبیہ ہے جو اپنے ایمان کے تقاضوں کو سمجھنے میں ابھی پوری طرح یک سو نہیں تھے، اور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نَفۡسَهٗ، وَاِلَی اللّٰهِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۲۸﴾ قُلۡ: اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ، اَوۡ تُبۡدُوۡهُ یَعۡلَمۡهُ اللّٰهُ، وَیَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ، وَمَا فِی الۡاَرۡضِ، وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ

کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ہاں، مگر یہ تہدید اُس صورت کے لیے نہیں ہے کہ تم اُن سے بچو، جیسا کہ بچنے کا حق ہے[51]۔ اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور (اِس لیے ڈراتا ہے کہ ایک دن تمھیں) اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے[52]۔ اِن (مسلمانوں) سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے[53]، تم اُسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اُسے جانتا ہے، اور زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اُسے بھی جانتا ہے، اور اللہ ہر

اس مرحلے پر بھی، جبکہ یہود و نصاریٰ کے لیے اللہ کا فیصلہ صادر ہونے والا تھا، نہ صرف یہ کہ ان کی طرف میلان رکھتے تھے، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں میں ان کے آلۂ کار بن جاتے تھے۔ اس میں 'من دون المومنین' (مسلمانوں کو چھوڑ کر) کی قید اس لیے لگائی ہے کہ یہ دوستی اگر اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نہ ہو تو اس کی ممانعت اس وقت بھی پیش نظر نہیں تھی۔

[۵۱] اصل میں 'الا ان تتقوا منهم تقة' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ جملہ 'فليس من الله فی شیء' سے استثنا ہے اور اس میں 'تقة' بالکل اسی طرح مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوا ہے جس طرح اسی سورہ کی آیت 'اتقوا الله حق تقته' (۱۰۲) میں ہے۔

[۵۲] یہ انھی کمزور اور منافق قسم کے مسلمانوں کو تنبیہ ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''(اس) میں منافقین کے لیے تنبیہ کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی کریمی سے دھوکے میں پڑ کے اس کی ذات کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز نہ کر جاؤ۔ وہ اگر شرارتوں سے درگزر کرتا ہے، سازشوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ریشہ دوانیوں کا فوراً نوٹس نہیں لیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ جرائم اس کے نزدیک جرائم نہیں یا وہ ان جرائم پر گرفت نہیں کر سکتا، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بندوں کو آخری حد تک مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت بہرحال مہلت ہے جو ایک دن ختم ہونی ہے۔ اس کے بعد اس کا عدل ظہور میں آئے گا اور یہ عدل بھی اس کی ذات ہی کا ایک پہلو ہے۔ یہ اگر ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ ظہور میں آئے گا ہی نہیں۔ خدا کے کاموں میں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ جب اس کی ذات کا یہ پہلو سامنے آئے گا تو ہر شخص پر کھل جائے گا کہ اس سے زیادہ زور آور، اس سے زیادہ بے لاگ اور اس سے بڑا منتقم و قہار کوئی بھی نہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/۶۸)

شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾ یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا، وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ، تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِیْدًا، وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ، وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ. ﴿۳۰﴾

قُلْ: اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ، فَاتَّبِعُوْنِیْ، یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ، وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ: اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ، فَاِنْ تَوَلَّوْا،

چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس دن ہر نفس اپنی کی ہوئی نیکی سامنے پائے گا اور اُس نے جو برائی کی ہوگی، اُسے بھی دیکھے گا[۵۴]، اُس دن وہ تمنا کرے گا کہ کاش اُس کے اور اِس (دن) کے درمیان ایک مدت حائل ہو جاتی۔ (یہ اللہ کی نصیحت ہے) اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور (اِس لیے ڈراتا ہے کہ) اللہ اپنے بندوں کے لیے بڑا مہربان ہے[۵۵]۔ ۲۸۔۳۰

اِن سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور (تم جانتے ہو کہ) اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۵۶]۔ کہہ دو کہ اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر (اِس کے بعد بھی) یہ منہ موڑیں تو (اِنھیں بتا دو کہ) اِس طرح کے

---

[۵۳] اشارہ ہے ان میلانات کی طرف جو یہ مسلمان یہود و نصاریٰ کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے۔

[۵۴] اصل الفاظ ہیں: 'ماعملت من سوء'۔ ان میں 'محضراً' کا لفظ محذوف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے 'ماعملت من خیر' میں یہ موجود ہے۔ چنانچہ عربیت کے اسلوب پر اس دوسرے ٹکڑے میں اسے حذف کر دیا ہے۔

[۵۵] یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں کے لیے بڑا مہربان ہے اور قیامت کے دن ان کو برے نتائج سے بچانا چاہتا ہے، اس لیے وہ اپنے آپ سے ان کو بار بار ہوشیار کر رہا ہے کہ وہ اس کی ڈھیل سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ جب پکڑے گا تو اس کی پکڑ بڑی سخت ہوگی، اس سے نکلنا کسی کے لیے ممکن نہ رہے گا۔

[۵۶] یہ ان مسلمانوں کو وہ صحیح رویہ سکھایا ہے جو سچے مسلمان کی حیثیت سے انھیں اختیار کرنا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ. ﴿۳۲﴾

منکروں کو اللہ پسند نہیں کرتا[57] ۔ ۳۱۔۳۲

[۵۷] نہایت سخت الفاظ میں یہ اس بات کا اعلان ہے کہ یہ لوگ سیدھے سیدھے اللہ اور رسول کی اطاعت کریں، ورنہ ان کو بھی انھی منکروں میں شامل سمجھا جائے گا جن سے یہ دوستی رکھتے ہیں۔

اس میں اور اس سے پہلے کی آیت میں جو باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں، وہ استاذ امام کے الفاظ میں یہ ہیں:

''ایک یہ کہ ان دونوں آیتوں کا لب ولہجہ الگ الگ ہے۔ پہلی آیت میں شفقت ہے اور دوسری میں تنبیہ، بلکہ تہدید۔ گویا درشتی و نرمی بہم در بہ است۔

دوسری یہ کہ ایمان کی اصل روح اللہ کی محبت ہے اور اس محبت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی محبت جمع نہ ہونے پائے جو اس کے ضد ہو۔

تیسری یہ کہ اللہ سے محبت کرنے کا واحد راستہ رسول کی پیروی ہے۔ اس سے ہٹ کر جو راستے نکالے گئے ہیں، وہ سب بدعت وضلالت ہیں۔

چوتھی یہ کہ خدا کی محبوبیت کا راستہ بھی رسول کی پیروی ہی ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی رسول کی سنت سے منحرف ہو اور وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ وہ خدا کا محبوب ہے یا دوسرے اس کو محبوب خدا سمجھیں تو یہ بالکل خبط ہے۔

پانچویں یہ کہ دین کا کم سے کم مطالبہ اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ پورا کرنے سے اعراض اختیار کرتا ہے تو اس کا شمار دین کے منکروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتا۔'' (تدبر قرآن ۲/۷۱)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طالب محسن

ایک صحابی کی اندیشہ ناکی

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۱۲۰۔۱۲۱)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عن ابی نضرة رضی اللّٰه عنه أن رجلا من اصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ــ یقال له: أبو عبد اللّٰه ــ دخل علیه أصحابه یعودونه وهو یبکی. فقالوا له: ما یبکیك؟ ألم یقل لك رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: خذ من شاربك ثم أقره حتی تلقانی؟ قال: بلی. ولكن سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: إن اللّٰه عزوجل قبض بیمینه قبضة وأخری بالید الأخری. وقال: هذه لهذه. وهذه لهذه. ولا أبالی. ولا أدری فی أی القبضتین أنا.

''حضرت ابونضرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک کے پاس جنھیں ابوعبداللہ کہتے ہیں، ان کے احباب عیادت کے لیے آئے اور وہ رو رہے تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا: کیوں رو رہے ہو؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے یہ نہیں فرمایا تھا: اپنی مونچھیں کاٹو، پھر اسی طریقے پر قائم رہو، یہاں تک کہ مجھ سے ملو۔ انھوں نے جواب دیا: کیوں نہیں؟ لیکن میں

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے (نسل انسانی کے ایک حصے کو) ایک مٹھی اور دوسرے (حصے کو) دوسری مٹھی میں لیا اور کہا: یہ اس (جنت) کے لیے ہے اور یہ اس (جہنم) کے لیے ہے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ میں ان دونوں میں سے کس مٹھی میں تھا۔''

لغوی مباحث

دخل علیه: یہ فعل جب 'علی' کے صلے کے ساتھ آتا ہے تو اس سے اس شخص سے ملاقات کے لیے آنا مراد ہوتا ہے۔ محض داخل ہونے کے معنی اگر پیش نظر ہوں تو اس کے ساتھ 'فی' آتا ہے اور اگر 'فی' نہ ہو تو اسے محذوف سمجھا جاتا ہے۔

أقره: 'قرر' سے باب افعال سے امر ہے۔ یعنی اسے قائم رکھ۔

قبض بیمینه قبضة: یعنی کچھ ذریت آدم کو اپنی دائیں مٹھی میں لیا۔ یہ اسلوب بیان اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم الگ الگ کیے گئے تھے۔ اس کی حقیقت طے کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ذرائع نہیں ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متون

یہ روایت مسند احمد سے لی گئی ہے اور اسے صرف امام احمد ہی نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ مسند احمد کے ہمارے پیش نظر نسخے اور جس نسخے سے صاحب مشکوٰۃ نے اسے لیا ہے، اس کے الفاظ میں بھی فرق ہے۔ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس فرق کی وجہ نسخوں میں فرق ہے۔ مسند احمد میں یہ روایت تین جگہ آئی ہے اور تینوں کے الفاظ میں معمولی نوعیت کے فرق ہیں۔ بنیادی طور پر روایت ایک ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام احمد نے اسے جن دو راویوں سے لیا ہے، وہ دونوں حماد سے روایت کرتے ہیں اور حماد سے اوپر اس روایت کی سند ایک ہی ہے۔

بہرحال پیش نظر روایت میں آغاز صحابی کے تعارف سے ہوا ہے۔ جب کہ دوسری دو روایتوں کا آغاز ایک صحابی کے بیمار ہونے کی اطلاع سے ہوا ہے۔ دوسرا نمایاں فرق آخری جملے کے بیان میں ہے۔ اس روایت میں یہ جملہ اختصار کے اسلوب میں ہے، جبکہ بعض روایات میں اسے تفصیل کے اسلوب میں نقل کیا گیا ہے۔ یعنی ایک ہاتھ کے لوگوں کا معاملہ الگ جملے میں اور دوسرے ہاتھ کے لوگوں کا معاملہ الگ جملے میں بیان ہوا ہے۔ اس کے علاوہ فرق صیغوں یا حروف عطف وغیرہ

کے ہیں۔مثلاً محولہ روایت میں 'و ھو یبکی ' ہے جبکہ دوسری روایت میں یہ 'فبکی' کے اسلوب میں آیا ہے۔اسی طرح بعض روایتوں میں آخری جملہ 'و لا أدری، فلا أدری 'یعنی حرف عطف 'ف ' کے ساتھ آیا ہے۔ایک روایت میں 'اقر ' کا امر اپنی دوسری صرفی صورت میں یعنی 'اقرر ' بھی آیا ہے۔

معنی

اس روایت کے دو حصے ہیں۔ایک حصہ صحابی رسول عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اضطراب سے متعلق ہے۔حقیقت یہ ہے کہ گروہ صحابہ کی دوسری امتیازی خصوصیات بھی ہیں، لیکن سب سے بڑھ کر قابل رشک ان کی آخرت کے معاملے میں فکرمندی ہے۔یہاں تک وہ صحابہ جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بخشش کی خبر دے دی گئی اور جنھیں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونے کی نوید ملی، وہ بھی آخرت کے معاملے میں کسی بے فکری میں مبتلا نہیں ہوئے۔

اس حصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جملے 'ثم أقره حتی تلقانی ' کو ایک پیش گوئی کی حیثیت سے لیا گیا ہے۔اس جملے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موت تک مونچھوں کو پست رکھنے کی تلقین کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے۔لیکن 'حتی تلقانی 'کی تعبیر سے یہ نکتہ سمجھا گیا ہے کہ اگر تم ایسا کرتے رہے تو مجھے جنت میں ملو گے۔یہ ایک دلچسپ بات ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیغمبر کے کلام کے بارے میں صحابہ کا انداز فکر کیا تھا۔

دوسرا حصہ نسل آدم کے زمین پر آباد کیے جانے سے پہلے اہل جنت اور اہل جہنم کی تعیین کو بیان کرتا ہے۔اس حصے سے یہ تاثر بھی ہوتا ہے کہ یہ تعین کسی اصول پر نہیں ہوا۔

قرآن مجید اس طرح کے کسی بیان یا اس نوع کے کسی واقعے کی طرف اشارے سے بھی خالی ہے۔عہد الست کے واقعے کے ساتھ بھی اس نوعیت کے کسی واقعے کی موزونیت سمجھ میں نہیں آتی۔اس روایت کے الفاظ جس طرح کی جبریت منوا رہے ہیں، اس کے پیش نظر اس روایت کو درست ماننا ناممکن ہے۔ممکن ہے صرف علم الٰہی کو بیان کیا گیا ہو جسے یہ شکل دے دی گئی۔

کتابیات

مسند احمد، رقم ۱۶۹۳۲، ۱۶۹۳۳، ۱۹۷۴۸۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عہد الست کا مقام

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنه عن النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم: أخذ اللّٰہ المیثاق من ظهر آدم بنعمان ــــ یعنی عرفة ــــ فأخرج من صلبه کل ذریة ذرأها . فنثرهم بین یدیه کالذر، ثم کلمهم قبلا . قال: ألست بربکم؟ قالوا: بلی شهدنا . أن تقولوا یوم القیامة إنا کنا عن هذا غافلین . أو تقولوا: إنما أشرك آباؤنا من قبل وکنا ذریة من بعدهم . أفتهلکنا بما فعل المبطلون؟

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آدم کی پشتوں سے نعمان یعنی عرفہ کے مقام پر عہد لیا تھا۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے وہ ساری نسل نکالی جس کو اس نے پھیلایا ہے۔ پھر اسے اپنے سامنے دانوں کی طرح بکھیر دیا۔ پھر اس سے روبرو بات کی: کیا میں تمھارا آقا نہیں ہوں؟ لوگوں نے کہا: کیوں نہیں؟ ہم گواہ ہیں۔ (یہ عہد ہم نے نہ لیا ہوتا تو ہوسکتا تھا) کہ تم قیامت کے دن کہتے: ہم تو (توحید کی) اس حقیقت سے بے خبر تھے۔ یا یہ کہتے: شرک تو اس سے پہلے ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم ان کے بعد کی نسل تھے۔ کیا آپ اس (جرم) کی پاداش میں ہلاک کریں گے جو اہل باطل نے کیا تھا؟''

لغوی مباحث

ظهر آدم: لفظی مطلب ہے: آدم کی پشت۔ جس طرح اردو میں پشت کا لفظ نسل کے معنی میں آتا ہے، اسی طرح اس جملے

میں 'ظہر' کا لفظ نسل آدم کے لیے آ گیا ہے۔

نعمان: صاحب مرقاۃ نے اس لفظ کے بارے میں مختلف آرا نقل کی ہیں۔ لکھتے ہیں: جوہری کے نزدیک اسے فتح کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور یہ طائف کے راستے کی ایک وادی ہے جو عرفات کی طرف نکلتی ہے۔ قاموس میں ہے: ایک وادی جو عرفات کے پیچھے ہے اور یہ 'نعمان اراک' ہے۔ نہایہ میں ہے: عرفہ کے قریب ایک پہاڑ جسے اس کی بلندی کی وجہ سے 'نعمان سحاب' کہتے ہیں۔ راوی نے عرفہ کا لفظ اس کے قرب کی وجہ سے کہا ہے۔

قبلا: یہ حال ہے اور اس کا مطلب ہے آمنے سامنے۔

متون

یہ روایت صرف مسند احمد میں ہے۔ کسی دوسری کتاب میں اس روایت کا کسی دوسرے طریق سے کوئی متن روایت نہیں ہوا۔ مسند احمد اور مشکوٰۃ کے متن میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معنی

روایت کا زیادہ حصہ قرآن مجید کے بیان سے متعلق ہے۔ یعنی عہد الست کے موقع پر جو مکالمہ اللہ تعالیٰ اور نسل آدم کے مابین ہوا اور اس کا جو حصہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، اسے بعینہٖ یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔ دو باتیں البتہ اس میں اضافی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ عہد عرفہ کے مقام پر لیا گیا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اور ذریت آدم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے یعنی ان کے مابین کوئی آڑ یا رکاوٹ نہیں تھی۔

قرآن مجید میں انسان کی دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (۲:۲۸)

''تم اللہ کا انکار کیسے کرتے ہو، درآں حالیکہ تم مردہ تھے، اس نے تمھیں زندگی دی، پھر وہ تمھیں مارے گا، پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جب اس کا بدن اور جان یک جا ہوتے ہیں۔ اسے قرآن زندگی قرار دیتا ہے۔ دوسری یہ کہ جب بدن نہیں ہوتا، یا بدن سے روح نکال لی جاتی ہے۔ اسے قرآن موت قرار دیتا ہے۔ شہدا کے بارے میں قرآن مجید کی تصریح سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس حالت میں بھی زندگی کی ایک کیفیت[1] ہے جسے

ہم سمجھ نہیں سکتے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عہد الست کا واقعہ بھی حیات کی اسی حالت میں لیا گیا تھا۔ ہم نہیں جان سکتے کہ اس حالت میں ہمارے دیکھنے، سمجھنے اور نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی نوعیت کیا ہے۔ لہٰذا یہ ماننے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ذریت آدم آمنے سامنے ہوں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی نفی کی گئی ہے، لیکن اس کا تعلق ہماری ان مادی آنکھوں سے ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہی یہ ہیں کہ 'لا تدرکه الابصار' اسے تمھاری یہ آنکھیں نہیں پا سکتیں۔

دوسری بات عرفہ سے متعلق ہے۔ روایت میں بیان کی گئی اس بات کی تصدیق وتصویب کا کوئی دوسرا ذریعہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ بائیبل اور قرآن مجید میں بنص صریح اس بارے میں کوئی بات بیان نہیں ہوئی۔ البتہ قرآن مجید کے اس بیان سے کہ میں زمین میں صاحب ارادہ واختیار مخلوق بنانے والا ہوں، اگر یہ قیاس کیا جائے کہ آدم علیہ السلام زمین پر ہی پیدا کیے گئے اور پہلے دن ہی سے زمین پر رہے تو یہ بیان کچھ مؤکد ہو جاتا ہے۔

کتابیات

مسند احمد، رقم ۲۳۲۷۔

۱؎ 'لا تقولوا لمن يقتل فی سبيل الله أمواتا بل أحياء ولكن لا تشعرون'۔ ''جو لوگ اللہ کی راہ میں مار دیے جائیں انھیں مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن تم اس کی حقیقت سمجھ نہیں سکتے۔'' (البقرہ ۲: ۱۵۴)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۱۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روزہ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ، لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ، وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ، فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ، وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ، اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ، ھُدًی لِّلنَّاسِ، وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ، فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ، وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ. یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ، وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ، وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ، وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ. (البقرہ۲: ۱۸۳۔۱۸۵)

”ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔ یہ گنتی کے چند دن ہیں۔ اس پر بھی جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔ اور جو اس کی طاقت رکھتے ہوں (کہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں) تو ان پر روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ پھر جو شوق سے کوئی نیکی

کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے، اور روزہ رکھ لو تو یہ تمھارے لیے اور بھی اچھا ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے رہنما بنا کر اور نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے سراسر ہدایت بھی ہیں اور حق و باطل کا فیصلہ بھی۔ سو تم میں سے جو شخص اس مہینے میں موجود ہو، اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرلے۔ (یہ رخصت اس لیے دی گئی ہے کہ) اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ تمھارے ساتھ سختی کرے۔ (اور فدیے کی اجازت اس لیے ختم کردی گئی ہے کہ) تم روزوں کی تعداد پوری کرو، (اور جو خیر و برکت اس میں چھپی ہوئی ہے، اس سے محروم نہ ہو)۔ اور (اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا اس لیے خاص کیا گیا ہے کہ قرآن کے صورت میں) اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر اس کی بڑائی کرو اور اس لیے کہ تم اُس کے شکر گزار بنو۔''

نماز کے بعد دوسری اہم عبادت روزہ ہے۔ عربی زبان میں اس کے لیے 'صوم' کا لفظ آتا ہے، جس کے معنی کسی چیز سے رک جانے اور اس کو ترک کردینے کے ہیں۔ گھوڑوں کو تربیت دینے کے لیے جب بھوکا اور پیاسا رکھا جاتا تھا تو اہل عرب اسے ان کے صوم سے تعبیر کرتے تھے۔ شریعت کی اصطلاح میں یہ لفظ خاص حدود و قیود کے ساتھ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں اسی کو روزہ کہتے ہیں۔ انسان چونکہ اس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا جذبۂ عبادت جب اس کے اس عملی وجود سے متعلق ہوتا ہے تو پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہوجاتا ہے۔ روزہ اسی اطاعت کا علامتی اظہار ہے۔ اس میں بندہ اپنے پروردگار کے حکم پر اور اس کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں بعض مباحات کو اپنے لیے حرام قرار دے کر مجسم اطاعت بن جاتا اور اس طرح گویا زبان حال سے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حکم سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اگر قانون فطرت کی رو سے جائز کسی شے کو بھی اس کے لیے ممنوع ٹھیرا دیتا ہے تو بندے کی حیثیت سے زیبا یہی ہے کہ وہ بے چون و چرا اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔

اللہ کی عظمت و جلالت اور اس کی بزرگی و کبریائی کے احساس و اعتراف کی یہ حالت، اگر غور کیجیے تو اس کی شکر گزاری کا حقیقی اظہار بھی ہے۔ چنانچہ قرآن نے اسی بنا پر روزے کو خدا کی تکبیر اور شکر گزاری قرار دیا اور فرمایا ہے کہ اس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا اس لیے خاص کیا گیا ہے کہ قرآن کی صورت میں اللہ نے جو ہدایت اس مہینے میں تمھیں عطا فرمائی ہے اور جس میں عقل کی رہنمائی اور حق و باطل کے مابین فرق و امتیاز کے لیے واضح اور قطعی حجتیں ہیں، اس پر اللہ کی بڑائی کرو اور اس کے شکر گزار بنو، 'لتکبروا اللّٰہ علی ما ھدٰکم، ولعلکم تشکرون'[۳۴۳]۔ روزے کی یہی حقیقت ہے جس کے پیش نظر کہا گیا ہے کہ روزہ اللہ کے لیے ہے اور وہی اس کی جزا دے گا۔ یعنی بندے نے جب بغیر کسی سبب کے محض اللہ کے حکم کی تعمیل

۳۴۳؎ البقرہ ۲: ۱۸۵۔

میں بعض جائز چیزیں بھی اپنے لیے ممنوع قرار دے لی ہیں تو اب وہ ناپ تول کر اور کسی حساب سے نہیں، بلکہ خاص اپنے کرم اور اپنی عنایت سے اس کا اجر دے گا اور اس طرح بے حساب دے گا کہ وہ نہال ہو جائے گا۔ ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم جو نیکی بھی کرتا ہے، اس کی جزا اسے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دی جاتی ہے، لیکن روزہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ 'فانه لی و انا اجزی به'، یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا، اس لیے کہ بندہ اپنے کھانے پینے اور اپنی جنسی خواہشات کو اس میں صرف میرے لیے چھوڑ دیتا ہے۔[۳۴۴] چنانچہ فرمایا ہے کہ روزہ رکھنے والوں کے لیے خوشی کے دو وقت ہیں: ایک جب وہ روزہ کھولتے ہیں، دوسرا جب وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے۔[۳۴۵] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عبادت کی اہمیت کس قدر غیر معمولی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لخلوف فم الصائم اطیب عند اللّٰہ تعالیٰ من ریح المسك. (بخاری، رقم ۱۸۹۴)	''روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔''

نیز فرمایا ہے:

ان فی الجنة باباً، یقال له الریان، یدخل منه الصائمون یوم القیٰمة، لایدخل معهم احد غیر هم، یقال: این الصائمون؟ فیدخلون منه، فاذا دخل آخر هم اغلق، فلم یدخل منه احد. (مسلم، رقم ۱۱۵۲)	''جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ریّان کہا جاتا ہے۔ روزہ دار قیامت کے دن اس سے جنت میں داخل ہوں گے، ان کے ساتھ کوئی دوسرا داخل نہ ہو سکے گا۔ پوچھا جائے گا: روزہ دار کہاں ہیں؟ پھر وہ اس سے داخل ہوں گے اور جب ان میں سے آخری شخص بھی داخل ہو جائے گا تو اسے بند کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد کوئی اس دروازے سے داخل نہ ہو گا۔''

اس عبادت کا منتہاے کمال شریعت میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی روزے کے حالت میں اپنے اوپر کچھ مزید پابندیاں عائد کر کے اور دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر چند دنوں کے لیے مسجد میں بیٹھ جائے اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کرے۔ اصطلاح میں اسے اعتکاف کہا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ رمضان کے روزوں کی طرح لازم تو نہیں کیا گیا، لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ روزہ و نماز اور تلاوت قرآن کے امتزاج سے 'آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را' کی جو خاص کیفیت اس سے پیدا ہوتی اور نفس پر تجرد و انقطاع اور تبتل الی اللہ کی جو حالت طاری ہو جاتی ہے، اس سے روزے کا اصلی

۳۴۴؎ بخاری، رقم ۱۷۹۵۔ مسلم، رقم ۱۱۵۱۔

۳۴۵؎ بخاری، رقم ۱۸۰۵۔ مسلم، رقم ۱۱۵۱۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مقصود درجۂ کمال پر حاصل ہوتا ہے۔ رمضان کے آخری دس دنوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی بنا پر ہر سال اپنی مسجد میں معتکف ہو جاتے[346] اور اپنے روز وشب دعا ومناجات، رکوع وسجود اور تلاوت قرآن کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ سیدہ عائشہ کا بیان ہے:

کان النبی صلی اللّٰه علیه و سلم اذا دخل العشر، شدّ مئزره، واحیا لیله، وایقظ اهله. (بخاری، رقم ۲۰۲۴)

''رمضان کا آخری عشرہ آتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر عبادت کے لیے کس لیتے، خود بھی شب بیداری فرماتے اور اپنے گھر والوں کو بھی اس کے لیے اٹھاتے تھے۔''

روزے کی یہ عبادت مسلمانوں پر رمضان کے مہینے میں لازم کی گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نفس کے میلانات کبھی ختم نہیں ہوتے اور اس دنیا کی ترغیبات بھی ہمیشہ باقی رہتی ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مہینے میں اپنا خاص کرم یہ فرماتے ہیں کہ شیاطین جن کے لیے لوگوں کو بہکانے کے تمام راستے بالکل بند کر دیتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے: رمضان آتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں[347]۔ چنانچہ اس مہینے میں ہر شخص کے لیے موقع ہوتا ہے کہ وہ اگر چاہے تو بغیر کسی خارجی رکاوٹ کے اپنے لیے خیر و فلاح کے حصول کی جدوجہد کر سکے۔ اس کا صلہ روایتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ آدمی کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ توبہ واصلاح کے بارے میں یہ قرآن کا عام قانون ہے، تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص رمضان کے حوالے سے لوگوں کو اس کی بشارت اس طرح دی ہے:

من صام رمضان ایماناً واحتساباً، غفرله ماتقدم من ذنبه. (بخاری، رقم ۱۹۰۱)

''جس نے ایمان واحتساب کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے، اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

من قام رمضان ایماناً واحتساباً، غفرله ماتقدم من ذنبه. (بخاری، رقم ۳۷)

''جس نے ایمان واحتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں قیام کیا، اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

یہی بات لیلۃ القدر میں قیام کے متعلق بھی کہی گئی ہے[348]۔ یہ نزول قرآن کی رات ہے اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ فرشتے اور روح الامین اس میں ہر معاملے کی اجازت لے کر اترتے ہیں، لہٰذا امور مہمہ کی تنفیذ کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے جو

۳۴۶؎ بخاری، رقم ۱۹۲۲۔ مسلم، رقم ۲۱۷۲۔

۳۴۷؎ بخاری، رقم ۱۸۰۰۔

۳۴۸؎ بخاری، رقم ۱۸۰۲۔ مسلم، رقم ۶۰۷۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رحمتیں، برکتیں اور قرب الٰہی کے جو مواقع اس ایک رات میں حاصل ہوتے ہیں، وہ ہزاروں راتوں میں بھی نہیں ہو سکتے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا ہے کہ 'لیلة القدر خیر من الف شهر'[349] (تقدیر کے فیصلوں کی یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسے رمضان کے آخری عشرے، بالخصوص اس کی طاق راتوں میں تلاش کرنا چاہیے۔[350]

عبادت کے لیے ایام و اوقات کی یہ تعیین کیا اہمیت رکھتی ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

''جس طرح اس مادی دنیا میں فصلوں، موسموں اور اوقات کا اعتبار ہے، اسی طرح روحانی عالم میں بھی ان کا اعتبار ہے۔ جس طرح خاص خاص چیزوں کے بونے کے لیے خاص خاص موسم اور مہینے ہیں، ان میں آپ بوتے ہیں تو وہ پروان چڑھتی اور مثمر ہوتی ہیں، اور اگر ان موسموں اور مہینوں کو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں تو دوسرے مہینوں کی طویل سے طویل مدت بھی ان کا بدل نہیں ہو سکتی، اسی طرح روحانی عالم میں بھی خاص خاص کاموں کے لیے خاص موسم اور خاص اوقات و ایام مقرر ہیں۔ اگر ان اوقات و ایام میں وہ کام کیے جاتے ہیں تو وہ مطلوبہ نتائج پیدا کرتے ہیں، اور اگر وہ ایام و اوقات نظر انداز ہو جاتے ہیں تو دوسرے ایام و اوقات کی زیادہ سے زیادہ مقدار بھی ان کی صحیح قائم مقامی نہیں کر سکتی۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ جمعہ کے لیے ایک خاص دن ہے، روزوں کے لیے ایک خاص مہینا ہے، حج کے لیے خاص مہینا اور خاص ایام ہیں، وقوف عرفہ کے لیے معینہ دن ہے۔ ان ایام و اوقات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی عبادتیں مقرر کر رکھی ہیں جن کے اجر و ثواب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، لیکن ان کی ساری برکتیں اپنی اصلی صورت میں تبھی ظاہر ہوتی ہیں، جب یہ ٹھیک ٹھیک ان ایام و اوقات کی پابندی کے ساتھ عمل میں لائی جائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ برکت فوت ہو جاتی ہے جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہے۔'' (۹/۴۶۸)

روزے کی تاریخ

نماز کی طرح روزے کی تاریخ بھی نہایت قدیم ہے۔ سورۂ بقرہ کی جو آیتیں اوپر نقل ہوئی ہیں، ان میں قرآن نے بتایا ہے کہ روزہ مسلمانوں پر اسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح وہ پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ تربیت نفس کی ایک اہم عبادت کے طور پر اس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے۔

نینوا اور بابل کی تہذیب نہایت قدیم ہے۔ ایک زمانے میں یہاں آشوری قوم آباد تھی۔ سیدنا یونس علیہ السلام کی بعثت انھی کی طرف ہوئی۔ ان لوگوں نے پہلے انھیں جھٹلا دیا، لیکن بعد میں ایمان لے آئے۔ اس موقع پر ان کی توبہ اور رجوع کا ذکر

۳۴۹؎ القدر ۹۷: ۱۔ ۵۔

۳۵۰؎ بخاری، رقم ۱۹۱۳، ۱۹۱۴، ۱۹۱۷۔ مسلم، رقم ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بائیبل کے ''صحیفۂ یونس'' میں اس طرح ہوا ہے:

''تب نینوا کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر روزہ کی منادی کی اور ادنیٰ واعلیٰ، سب نے ٹاٹ اوڑھا۔ اور یہ خبر نینوا کے بادشاہ کو پہنچی اور وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس کو اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ اور اس کے ارکان دولت کے فرمان سے نینوا میں یہ اعلان کیا گیا اور اس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان، گلہ یا رمہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے پیے، لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے ملبس ہوں اور خدا کے حضور گریہ وزاری کریں، بلکہ ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے۔'' (۳: ۵۔۸)

عرب جاہلی میں بھی روزہ کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ ان کی زبان میں لفظ 'صوم' کا وجود بجائے خود اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اس عبادت سے پوری طرح واقف تھے۔ ''المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام'' میں جواد علی لکھتے ہیں:

''روایتوں میں ہے کہ قریش یوم عاشور کا روزہ رکھتے تھے۔ اس روز وہ جمع ہوتے، عید مناتے اور بیت اللہ کو غلاف پہناتے تھے۔ اس کی توجیہ مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ قریش جاہلیت میں کوئی ایسا گناہ کر بیٹھے تھے جس کا بوجھ انھوں نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ چنانچہ اس کا کفارہ ادا کرنا چاہا تو یوم عاشور کا روزہ اپنے لیے مقرر کر لیا۔ وہ اس دن یہ روزہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے رکھتے تھے کہ اس نے انھیں اس گناہ کے برے نتائج سے محفوظ رکھا۔ روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبوت سے پہلے یہ روزہ رکھتے تھے... اس روزے کی ایک توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قریش کو ایک زمانے میں قحط نے آ لیا، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سے نجات عطا فرمائی تو انھوں نے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے یہ روزہ رکھنا شروع کر دیا۔'' (۶/۳۳۹۔۳۴۰)

یہود ونصاریٰ کی شریعت میں بھی روزہ ایک عام عبادت ہے۔ بائیبل میں ان کے روزوں کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے اور اس کے لیے خاص اس لفظ کے علاوہ بعض مقامات پر 'جان کو دکھ دینے' اور 'نفس کشی کرنے' کی تعبیرات بھی اختیار کی گئی ہیں۔

خروج میں ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو یہ باتیں لکھ، کیونکہ انھی باتوں کے مفہوم کے مطابق میں تجھ سے اور اسرائیل سے عہد باندھتا ہوں۔ سو وہ چالیس دن اور چالیس رات وہیں خداوند کے پاس رہا اور نہ روٹی کھائی اور نہ پانی پیا اور اس نے ان لوحوں پر اس عہد کی باتوں کو، یعنی دس احکام کو لکھا۔'' (۳۴: ۲۷۔۲۸)

احبار میں ہے:

''اور یہ تمھارے لیے ایک دائمی قانون ہو کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو تم اپنی اپنی جان کو دکھ دینا اور اس دن کوئی، خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی جو تمھارے بیچ بودوباش رکھتا ہو، کسی طرح کا کام نہ کرے۔ کیونکہ اس روز تمھارے واسطے تم کو پاک

کرنے کے لیے کفارہ دیا جائے گا۔ سو تم اپنے سب گناہوں سے خداوند کے حضور پاک ٹھیرو گے۔ یہ تمھارے لیے خاص آرام کا سبت ہوگا۔ تم اس دن اپنی اپنی جان کو دکھ دینا۔'' (۱۶: ۲۹۔۳۱)

قضاۃ میں ہے:

''تب سب بنی اسرائیل اور سب لوگ اٹھے اور بیت ایل میں آئے اور وہاں خداوند کے حضور بیٹھے روتے رہے اور اس دن شام تک روزہ رکھا اور سوختنی قربانیاں اور سلامتی کی قربانیاں خداوند کے آگے گزرانیں۔'' (۲۰: ۲۶)

سموئیل دوم میں ہے:

''اور وہ ساؤل اور اس کے بیٹے یونتن اور خداوند کے لوگوں اور اسرائیل کے گھرانے کے لیے نوحہ کرنے اور رونے لگے اور شام تک روزہ رکھا، اس لیے کہ وہ تلوار سے مارے گئے تھے۔'' (۱: ۱۲)

''اس لیے داؤد نے اس لڑکے کی خاطر خدا سے منت کی اور داؤد نے روزہ رکھا اور اندر جا کر ساری رات زمین پر پڑا رہا۔'' (۱۲: ۱۶)

نحمیاہ میں ہے:

''پھر اسی مہینے کی چوبیسویں تاریخ کو بنی اسرائیل روزہ رکھ کر اور ٹاٹ اوڑھ کر اور مٹی اپنے سر پر ڈال کر اکٹھے ہوئے۔ اور اسرائیل کی نسل کے لوگ سب پردیسیوں سے الگ ہو گئے اور کھڑے ہو کر اپنے گناہوں اور اپنے باپ دادا کی خطاؤں کا اقرار کیا۔'' (۹: ۱۔۲)

زبور میں ہے:

''لیکن میں نے تو ان کی بیماری میں، جب وہ بیمار تھے، ٹاٹ اوڑھا اور روزہ رکھ رکھ کر اپنی جان کو دکھ دیا اور میری دعا میرے ہی سینے میں واپس آئی۔'' (۳۵: ۱۳)

یرمیاہ میں ہے:

''پر تو جا اور خداوند کا وہ کلام جو تو نے میرے منہ سے اس طومار میں لکھا ہے، خداوند کے گھر میں روزہ کے دن لوگوں کو پڑھ کر سنا۔'' (۳۶: ۶)

یوایل میں ہے:

''خداوند کا روز عظیم نہایت خوف ناک ہے۔ کون اس کی برداشت کر سکتا ہے؟ لیکن خداوند فرماتا ہے: اب بھی پورے دل سے اور روزہ رکھ کر اور گریہ وزاری و ماتم کرتے ہوئے میری طرف رجوع لاؤ۔ اور اپنے کپڑوں کو نہیں، بلکہ دلوں کو چاک کر کے خداوند اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو، کیونکہ وہ رحیم و مہربان، قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے باز رہتا ہے۔'' (۲: ۱۱۔۱۳)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

زکریا میں ہے:

''پھر رب الافواج کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ چوتھے اور پانچویں اور ساتویں اور دسویں مہینے کا روزہ بنی یہوداہ کے لیے خوشی اور خرمی کا دن اور شادمانی کی عید ہوگا۔'' (۸: ۱۸۔۱۹)

متی میں ہے:

''اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ ان کو روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے، بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو تاکہ آدمی نہیں، بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے، تجھے روزہ دار جانے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھے بدلہ دے گا۔'' (۶: ۱۶۔۱۸)

اعمال میں ہے:

''جب وہ خداوند کی عبادت کر رہے اور روزے رکھ رہے تھے تو روح القدس نے کہا: میرے لیے برنباس اور ساؤل کو اس کام کے واسطے مخصوص کر دو، جس کے واسطے میں نے ان کو بلایا ہے۔ تب انھوں نے روزہ رکھ کر اور دعا کر کے اور ان پر ہاتھ رکھ کر انھیں رخصت کیا۔'' (۱۳: ۲۔۳)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ روزے کی تاریخ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ نماز کی طرح روزہ بھی قرآن کے مخاطبین کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ وہ اس کی مذہبی حیثیت اور اس کے حدود و شرائط سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ قرآن نے جب اس کا حکم دیا تو ان حدود و شرائط میں سے کوئی چیز بھی بیان نہیں کی، بلکہ ہدایت فرمائی کہ خدا کے ایک قدیم حکم اور انبیا علیہم السلام کی ایک قدیم سنت کے طور پر وہ جس طرح اسے جانتے ہیں، اسی طرح ایک لازمی عبادت کے طور پر اس کا اہتمام کریں۔ اس لحاظ سے روزے کا ماخذ بھی اصلاً مسلمانوں کا اجماع اور ان کا عملی تواتر ہی ہے۔ قرآن نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ اسے فرض قرار دیا، مریضوں اور مسافروں کے لیے اس سے رخصت کا قانون بیان فرمایا اور بعد میں جب بعض سوالات اس سے متعلق پیدا ہوئے تو ان کی وضاحت کر دی ہے۔

روزے کا مقصد

روزے کا مقصد قرآن مجید نے سورۂ بقرہ کی ان آیتوں میں یہ بیان کیا ہے کہ لوگ خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ اس کے لیے اصل میں 'لعلکم تتقون' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے شب و روز کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رکھ کر زندگی بسر کرے اور اپنے دل کی

گہرائیوں میں اس بات سے ڈرتا رہے کہ اس نے اگر کبھی ان حدود کو توڑا تو اس کی پاداش سے اللہ کے سوا کوئی اس کو بچانے والا نہیں ہو سکتا۔

روزے سے یہ تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے تین باتیں پیش نظر رہنی چاہییں:

پہلی یہ کہ روزہ اس احساس کو آدمی کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ نفس کے چند بنیادی مطالبات پر حرمت کا قفل لگتے ہی یہ احساس بندگی پیدا ہونا شروع ہوتا اور پھر بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ روزہ کھولنے کے وقت تک یہ اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔ فجر سے مغرب تک کھانے کا ایک نوالہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی روزے دار کے حلق سے نہیں گزرتا اور وہ ان چیزوں کے لیے نفس کے ہر مطالبے کو محض اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ روزے کا یہ عمل جب بار بار دہرایا جاتا ہے تو یہ حقیقت روزے دار کے نہاں خانۂ وجود میں اتر جاتی، بلکہ اس کی جبلت میں پیوست ہو جاتی ہے کہ وہ ایک پروردگار کا بندہ ہے اور اس کے لیے زیبا یہی ہے کہ زندگی کے باقی معاملات میں بھی تسلیم واعتراف کے ساتھ وہ اپنے مالک کی فرماں روائی کے سامنے سپر ڈال دے اور خیال وعمل، دونوں میں اپنی آزادی اور خودمختاری کے ادعا سے دستبردار ہو جائے۔ اس سے، ظاہر ہے کہ خدا پر آدمی کا ایمان ہر لحاظ سے زندہ ایمان بن جاتا ہے، جس کے بعد وہ محض ایک خدا کو نہیں، بلکہ ایک ایسی سمیع وبصیر، علیم وحکیم اور قائم بالقسط ہستی کو مانتا ہے جو اس کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے اور جس کی اطاعت سے وہ کسی حال میں انحراف نہیں کر سکتا۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہی ہے۔

دوسری یہ کہ روزہ اس احساس کو بھی دل کے اعماق اور روح کی گہرائیوں میں اتار دیتا ہے کہ آدمی کو ایک دن اپنے پروردگار کے حضور میں جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے۔ ماننے کو تو یہ بات ہر مسلمان مانتا ہے، لیکن روزے میں جب پیاس تنگ کرتی، بھوک ستاتی اور جنسی جذبات پوری قوت کے ساتھ اپنی تسکین کا تقاضا کرتے ہیں تو ہر شخص جانتا ہے کہ تنہا یہی احساس جواب دہی ہے جو آدمی کو بطن وفرج کے ان مطالبات کو پورا کرنے سے روک دیتا ہے۔ رمضان کا پورا مہینا ہر روز گھنٹوں وہ نفس کے ان بنیادی تقاضوں پر محض اس لیے پہرا لگائے رکھتا ہے کہ اسے ایک دن اپنے مالک کو منہ دکھانا ہے۔ یہاں تک کہ سخت گرمی کی حالت میں حلق پیاس سے چٹختا ہے، برفاب سامنے ہوتا ہے، وہ چاہے تو آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا؛ بھوک کے مارے جان نکل رہی ہوتی ہے، کھانا موجود ہوتا ہے، مگر نہیں کھاتا؛ میاں بیوی جوان ہیں، تنہائی میسر ہے، چاہیں تو اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں، مگر نہیں کرتے۔ یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں جواب دہی کا احساس اس سے دل ودماغ میں پوری طرح راسخ ہو جاتا ہے۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے، اگر غور کیجیے تو دوسری موثر ترین چیز یہی ہے۔

تیسری یہ کہ تقویٰ کے لیے صبر ضروری ہے، اور روزہ انسان کو صبر کی تربیت دیتا ہے۔ بلکہ صبر کی تربیت کے لیے اس سے زیادہ آسان اور اس زیادہ موثر کوئی دوسرا طریقہ شاید نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ہم جس امتحان سے دوچار ہیں، اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ ایک طرف ہمارے حیوانی وجود کی منہ زور خواہشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے کہ ہم اس کے حدود میں رہ کر زندگی بسر کریں؟ یہ چیز قدم قدم پر صبر کا تقاضا کرتی ہے۔ سچائی، دیانت، تحمل، بردباری، عہد کی پابندی، عدل وانصاف، عفو و درگزر، منکرات سے گریز، فواحش سے اجتناب اور حق پر استقامت کے اوصاف نہ ہوں تو تقویٰ کے کوئی معنی نہیں ہیں، اور صبر کے بغیر یہ اوصاف، ظاہر ہے کہ آدمی میں کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتے۔

روزے کا مقصد یہی تقویٰ ہے اور اس کے لیے اللہ نے رمضان کا مہینا مقرر فرمایا ہے۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ اس مہینے میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا ہے۔ روزے کے مقصد سے اس کا کیا تعلق ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ''غور کرنے والے کو اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آ سکتی کہ خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے اور عقل سے بھی بڑی نعمت قرآن ہے، اس لیے کہ عقل کو بھی حقیقی رہنمائی قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو عقل سائنس کی ساری دوربینیں اور خردبینیں لگا کر بھی اندھیرے میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے جس مہینے میں دنیا کو یہ نعمت ملی، وہ سزاوار تھا کہ وہ خدا کی تکبیر اور اس کی شکر گزاری کا خاص مہینا ٹھیرا دیا جائے تاکہ اس نعمت عظمیٰ کی قدر و عظمت کا اعتراف ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے۔ اس شکر گزاری اور تکبیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی عبادت مقرر فرمائی جو اس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین و شریعت کے قیام و بقا کا انحصار ہے، اور جس کے حاملین ہی کے لیے درحقیقت قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے ... گویا اس حکمت قرآنی کی ترتیب یوں ہوئی کہ قرآن حکیم کا حقیقی فیض صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اس تقویٰ کی تربیت کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے۔ اس وجہ سے رب کریم و حکیم نے اس مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اس دنیا کے لیے بہار ہے اور رمضان کا مہینا موسم بہار اور یہ موسم بہار جس فصل کو نشوونما بخشتا ہے، وہ تقویٰ کی فصل ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۵۱)

یہ مقصد روزے سے لازماً حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ روزہ رکھنے والے ان خرابیوں سے بچیں جو اگر روزے کو لاحق ہو جائیں تو اس کی تمام برکتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ خرابیاں اگرچہ بہت سی ہیں، مگر ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ ہر روزے دار کو ان کے بارے میں ہوشیار رہنا چاہیے۔

ان میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ لوگ رمضان کو لذتوں اور چٹخاروں کا مہینا بنا لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس مہینے میں جو خرچ بھی کیا جائے، اس کا اللہ کے ہاں کوئی حساب نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرح کے لوگ اگر کچھ کھاتے پیتے بھی ہوں تو ان

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے لیے یہ پھر مزے اڑانے اور بہار لوٹنے کا مہینا ہے۔ وہ اس کو نفس کی تربیت کے بجائے اس کی پرورش کا مہینا بنا لیتے ہیں اور ہر روز افطار کی تیاریوں ہی میں صبح کو شام کرتے ہیں۔ وہ جتنا وقت روزے سے ہوتے ہیں، یہی سوچتے ہیں کہ سارے دن کی بھوک پیاس سے جو خلا ان کے پیٹ میں پیدا ہوا ہے، اسے وہ اب کن کن نعمتوں سے بھریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو روزے سے وہ کچھ پاتے ہی نہیں، اور اگر کچھ پاتے ہیں تو اسے وہیں کھو دیتے ہیں۔

اس خرابی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر کام کی قوت کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیے تو ضرور، لیکن اس کو جینے کا مقصد نہ بنا لے۔ جو کچھ بغیر کسی اہتمام کے مل جائے، اس کو اللہ کا شکر کرتے ہوئے کھا لے۔ گھر والے جو کچھ دستر خوان پر رکھ دیں، وہ اگر دل کو نہ بھی بھائے تو اس پر خفا نہ ہو۔ اللہ نے اگر مال و دولت سے نوازا ہے تو اپنے نفس کو پالنے کے بجائے اسے غریبوں اور فقیروں کی مدد اور ان کے کھانے پلانے پر خرچ کرے۔ یہ چیز یقیناً اس کے روزے کی برکتوں کو بڑھائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ انفاق کے معاملے میں یہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ حضور عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے، لیکن رمضان میں تو گویا سراپا جود و کرم بن جاتے تھے۔[۳۵۱]

دوسری خرابی یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی حالت میں چونکہ طبیعت میں کچھ تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اس وجہ سے بعض لوگ روزے کو اس کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے بجائے، اسے جھڑکانے کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے نیچے کام کرنے والوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے، جو منہ میں آیا، کہہ گزرتے، بلکہ بات بڑھ جائے تو گالیوں کا جھاڑ باندھ دیتے ہیں، اور بعض حالتوں میں اپنے زیردستوں کو مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ روزے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس کا علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ آدمی اس طرح کے موقعوں پر روزے کو اشتعال کا بہانہ بنانے کے بجائے اس کے مقابلے میں ایک ڈھال کی طرح استعمال کرے، اور جہاں اشتعال کا کوئی موقع پیدا ہو، فوراً یاد کرے کہ میں روزے سے ہوں۔ آپ کا ارشاد ہے: روزے ڈھال ہیں، لہٰذا تم میں سے جس شخص کا روزہ ہو، وہ نہ بے حیائی کی باتیں کرے، اور نہ جہالت دکھائے۔ پھر اگر کوئی گالی دے یا لڑنا چاہے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں، میرے بھائی میں روزے سے ہوں۔[۳۵۲] چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ روزہ رکھنے والا اگر غصے اور اشتعال کے ہر موقع پر یاددہانی کا یہ طریقہ اختیار کرے گا تو آہستہ آہستہ دیکھے گا کہ اس نے اپنے نفس کے شیطان پر اتنا قابو پا لیا ہے کہ وہ اب اسے گرا لینے میں کم ہی کامیاب ہوتا ہے۔ شیطان کے مقابلے میں فتح کا یہ احساس اس کے دل میں اطمینان اور برتری کا احساس پیدا کرے گا اور روزے کی یہی

۳۵۱؎ بخاری، رقم ۶۔ مسلم، رقم ۲۳۰۸۔

۳۵۲؎ بخاری، رقم ۱۷۹۳۔ مسلم، رقم ۱۱۵۱۔

یاد دہانی اس کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے گی۔ پھر وہ وہیں غصہ کرے گا، جہاں اس کا موقع ہو گا۔ وقت بے وقت اسے مشتعل کر دینا کسی کے لیے ممکن نہ رہے گا۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ بہت سے لوگ جب روزے میں کھانے پینے اور اس طرح کی دوسری دل چسپیوں کو چھوڑتے ہیں تو اپنی اس محرومی کا مداوا ان دل چسپیوں میں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن سے ان کے خیال میں روزے کو کچھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بہل جاتا ہے۔ وہ روزہ رکھ کر تاش کھیلیں گے، ناول اور افسانے پڑھیں گے، نغمے اور غزلیں سنیں گے، فلمیں دیکھیں گے، دوستوں میں بیٹھ کر گپ ہانکیں گے اور اگر یہ سب نہ کریں گے تو کسی کی غیبت اور ہجو ہی میں لپٹ جائیں گے۔ روزے میں پیٹ خالی ہو تو آدمیوں کو اپنے بھائیوں کا گوشت کھانے میں ویسے بھی بڑی لذت ملتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات صبح اس مشغلے میں پڑتے ہیں اور پھر مؤذن کی اذان کے ساتھ ہی اس سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔

اس خرابی کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کا ادب سمجھے اور کوشش کرے کہ کم سے کم اناپ شناپ کہنے اور جھوٹی سچی اڑانے کے معاملے میں تو اس کی زبان پر تالا لگا رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی کچھ ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔[۳۵۳]

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ جو وقت ضروری کاموں سے بچے، اس میں آدمی قرآن وحدیث کا مطالعہ کرے اور دین کو سمجھے۔ وہ روزے کی اس فرصت کو غنیمت جان کر اس میں قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعاؤں کا کچھ حصہ یاد کر لے۔ اس طرح وہ روزے میں ان مشغلوں سے بچے گا اور بعد میں یہی ذخیرہ اللہ کی یاد کو اس کے دل میں قائم رکھنے کے لیے اس کے کام آئے گا۔

چوتھی خرابی یہ ہے کہ آدمی بعض اوقات روزہ اللہ کے لیے نہیں، بلکہ اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کی ملامت سے بچنے کے لیے رکھتا ہے اور کبھی لوگوں میں اپنی دین داری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے یہ مشقت جھیلتا ہے۔ یہ چیز بھی روزے کو روزہ نہیں رہنے دیتی۔

اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی روزے کی اہمیت ہمیشہ اپنے نفس کے سامنے واضح کرتا رہے اور اسے تلقین کرے کہ جب کھانا پینا اور دوسری لذتیں چھوڑ ہی رہے ہو تو پھر اللہ کے لیے کیوں نہیں چھوڑتے۔ اس کے ساتھ رمضان کے علاوہ کبھی کبھی نفلی روزے بھی رکھے اور انھیں زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرے۔ اس سے امید ہے کہ اس کے یہ فرض روزے بھی کسی وقت اللہ ہی کے لیے خالص ہو جائیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نفل روزے خود رکھے ہیں یا لوگوں کو اسی مقصد سے ان کے رکھنے کی ترغیب دی ہے، وہ یہ

---

۳۵۳ بخاری، رقم ۱۸۹۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہیں:

یوم عاشور کا روزہ

روایتوں میں اس کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔[354] آپ بالعموم اس کا اہتمام کرتے تھے،[355] بلکہ رمضان کے روزوں سے پہلے تو یہ روزہ آپ لازماً رکھتے اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیتے، اس پر ابھارتے اور اس معاملے میں ان پر نگران رہتے تھے۔[356] اس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قریش یہ روزہ رکھتے تھے[357] اور ایک یہ بیان کی گئی ہے کہ یہود اس دن کا روزہ رکھتے تھے۔ حضور نے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ دن ان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ موسیٰ اور ان کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے اس دن نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو دریا میں غرق کر دیا، تب موسیٰ علیہ السلام نے اس پر شکرانے کا روزہ رکھا تھا۔ حضور نے فرمایا: موسیٰ سے ہمارا تعلق تم سے زیادہ ہے۔ چنانچہ آپ نے بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی۔[358]

یوم عرفہ کا روزہ

اس دن کی فضیلت ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس میں روزہ رکھا جائے تو اس کے صلے میں توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ بخش دیں گے۔[359] تاہم حج کے موقع پر آپ نے یہ روزہ نہیں رکھا۔[360] اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ حج کی مشقت کے ساتھ آپ نے اسے جمع کرنا پسند نہیں فرمایا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شوال کے روزے

ان روزوں کی فضیلت بھی روایتوں میں بیان ہوئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے، پھر ان کے متصل بعد شوال کے چھ روزے رکھ لیے، وہ گویا عمر بھر روزے سے رہا۔[361]

ہر مہینے میں تین روزے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ترغیب دی اور ان کے بارے میں وہی بات فرمائی ہے جو اوپر شوال کے روزوں

۳۵۴؎ بخاری، رقم ۱۹۰۲۔ مسلم، رقم ۱۱۶۲۔

۳۵۵؎ بخاری، رقم ۱۸۹۹۔ مسلم، رقم ۱۱۲۹۔

۳۵۶؎ بخاری، رقم ۴۲۳۴۔ مسلم، رقم ۱۱۲۸۔

۳۵۷؎ بخاری، رقم ۱۸۹۴۔ مسلم، رقم ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔

۳۵۸؎ بخاری، رقم ۱۹۰۰۔ مسلم، رقم ۱۱۳۰۔

۳۵۹؎ مسلم، رقم ۱۱۶۲۔

۳۶۰؎ بخاری، رقم ۱۵۷۸۔ مسلم، رقم ۱۱۲۳۔

۳۶۱؎ مسلم، رقم ۱۱۶۴۔

کے بارے میں بیان ہوئی ہے۔[۳۶۲] سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ حضور خود بھی یہ روزے رکھتے تھے۔ تاہم ان کے لیے کوئی دن متعین نہیں تھے۔ آپ جب چاہتے، پورے مہینے میں کسی وقت یہ روزے رکھ لیتے تھے۔[۳۶۳] بعض صحابہ کو، البتہ آپ نے ہدایت فرمائی ہے کہ وہ چاند کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کو یہ روزے رکھیں۔[۳۶۴]

پیر اور جمعرات کا روزہ

حضور نے یہ روزے بھی رکھے ہیں۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: پیر اور جمعرات کے دن لوگوں کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔[۳۶۵] نیز فرمایا کہ پیر کا دن میری پیدایش کا دن ہے اور مجھ پر قرآن کا نزول بھی اسی دن ہوا تھا۔[۳۶۶]

شعبان کے روزے

رمضان کے علاوہ یہی مہینا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر روزے سے رہتے تھے۔ سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ میں نے شعبان سے زیادہ آپ کو کسی مہینے میں روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔[۳۶۷]

ان کے علاوہ بھی لوگ جب چاہیں، نفل روزے رکھ سکتے ہیں۔ زیادہ روزوں کی خواہش رکھنے والوں کو آپ نے ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اس معاملے میں سیدنا داؤد علیہ السلام کی پیروی کریں جو ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑ دیتے تھے۔[۳۶۸] تنہا جمعہ کو روزے کے لیے خاص کر لینے،[۳۶۹] پورا سال روزے رکھنے[۳۷۰] اور عید کے دنوں میں روزہ رکھنے کو،[۳۷۱] البتہ آپ نے پسند نہیں فرمایا۔[۳۷۲]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamdi.com

۳۶۲؎ بخاری، رقم ۱۸۷۵، ۱۸۸۰۔ مسلم، رقم ۱۱۶۲۔

۳۶۳؎ مسلم، رقم ۱۱۶۰۔

۳۶۴؎ ابوداؤد، رقم ۲۴۴۹۔

۳۶۵؎ ابوداؤد، رقم ۲۴۳۶۔

۳۶۶؎ مسلم، رقم ۱۱۶۲۔

۳۶۷؎ بخاری، رقم ۱۸۶۸، ۱۸۶۹۔ مسلم، رقم ۱۱۵۶۔

۳۶۸؎ بخاری، رقم ۱۸۷۵۔ مسلم، رقم ۱۱۵۹۔

۳۶۹؎ بخاری، رقم ۱۸۸۳، ۱۸۸۴۔ مسلم، رقم ۱۱۴۳، ۱۱۴۴۔

۳۷۰؎ بخاری، رقم ۱۸۷۴۔ مسلم، رقم ۱۱۶۲۔

۳۷۱؎ بخاری، رقم ۱۸۸۹، ۱۸۹۰۔ مسلم، رقم ۱۱۳۷، ۱۱۳۸۔

۳۷۲؎ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی چیز تھوڑے ہی عرصے میں بدعت بن جاتی، دوسری زندگی کا توازن درہم برہم کر دیتی اور تیسری بالکل بے محل ہوتی جس کے لیے اس دین قیم میں ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہوسکتی۔

روزے کا قانون

انبیا علیہم السلام کے دین میں روزے کا جو قانون ہمیشہ سے رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسی کے مطابق روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ ایمان والوں پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے، جس طرح ان سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا ہے۔ فرمایا ہے کہ یہ گنتی کے چند دن ہیں جو اس عبادت کے لیے خاص کیے گئے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ تالیف قلب کے طور پر کہی گئی ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ روزے کی برکتیں اگر پیش نظر ہوں تو بارہ مہینوں میں ۳۰ یا ۲۹ دن کوئی بڑی مدت نہیں ہے، بلکہ گنتی کے چند دن ہی ہیں، لہٰذا گھبرانے یا دل شکستہ ہونے کے بجائے آدمی کو ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اس تمہید کے بعد رخصت کا حکم بیان ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہ کر سکیں، وہ دوسرے دنوں میں یا تو روزے رکھ کر یہ تعداد پوری کر لیں، یا ایک روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر چھوڑے ہوئے روزوں کی تلافی کریں۔ اس حکم کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے: 'فمن تطوع خیراً فهو خیر له، و ان تصوموا خیر لكم ، ان كنتم تعلمون ' (پھر جو شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے اور روزہ رکھ لو تو یہ تمھارے لیے اور بھی اچھا ہے، اگر تم سمجھتے ہو)۔ مطلب یہ ہے کہ روزے کا یہ فدیہ کم سے کم مطالبہ ہے جو استطاعت رکھنے والوں کو ہر حال میں پورا کرنا چاہیے، لیکن اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا ان کے ساتھ کوئی اور نیکی کر دے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ پھر اللہ کے نزدیک اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ آدمی فدیے کے بجائے دوسرے دنوں میں روزے ہی پورے کرے۔

تاہم اس کے بعد جو آیت 'شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن ' کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے، اس میں فدیے کی اجازت ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ حکم کو بعینہٖ دہرا کر اس میں سے 'و علی الذین یطیقونه' سے 'ان كنتم تعلمون ' تک کے الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ رمضان کے بعد عام دنوں میں روزہ رکھنا چونکہ مشکل ہوتا ہے، اس لیے جب تک طبائع اس کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے اسے لازم نہیں کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ فدیے کی یہ اجازت اس لیے ختم کر دی گئی ہے کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو اور جو خیر و برکت اس میں چھپی ہوئی ہے، اس سے محروم نہ رہو۔

روزے کا حکم اصلاً یہی ہے۔ اس کے بعد، معلوم ہوتا ہے کہ بعض سوالات لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک اہم سوال یہ تھا کہ رمضان کی راتوں میں بیویوں کے پاس جانا جائز ہے یا نہیں؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ یہود کے ہاں روزہ افطار کے معاً بعد پھر شروع ہو جاتا تھا اور وہ روزے کی رات میں کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مسلمانوں نے اس سے گمان کیا کہ ان کے لیے بھی یہی قانون ہو گا، لیکن پھر ان میں سے بعض لوگ یہ گمان اپنے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دلوں میں رکھتے ہوئے اس کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ یہ کوئی اچھی بات نہ تھی، اس لیے کہ آدمی اگر اپنے اجتہاد یا گمان کے مطابق کسی چیز کو دین وشریعت کا تقاضا سمجھتا ہے تو اس سے قطع نظر کہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم ہے یا نہیں، اس کی خلاف ورزی اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے اسے ضمیر کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا اور وضاحت فرمائی:

اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ، هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ، فَتَابَ عَلَیْکُمْ، وَعَفَا عَنْکُمْ، فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ، وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ، وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا، حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ، وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰکِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ. تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا، کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ، لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲:۱۸۷)

”روزوں کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا تمھارے لیے جائز کیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے درگزر کیا۔ چنانچہ اب (بغیر کسی تردد کے) اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اور (اِس کا) جو (نتیجہ) اللہ نے تمھارے لیے لکھ رکھا ہے، اسے چاہو، اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ رات کی سیاہ دھاری سے فجر کی سفید دھاری تمھارے لیے بالکل نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک اپنا روزہ پورا کرو اور (ہاں) تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو (پھر رات کو بھی) ان کے پاس نہ جانا۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، سو ان کے قریب نہ جاؤ۔ اللہ اسی طرح اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔“

قرآن کی اس وضاحت کے بعد روزے اور اعتکاف کا جو قانون متعین ہو کر سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے:

روزے کی نیت سے اور محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے سے اجتناب ہی شریعت کی اصطلاح میں روزہ ہے،

یہ پابندی فجر سے لے کر رات کے شروع ہونے تک ہے، لہٰذا روزے کی راتوں میں کھانا پینا اور بیویوں کے پاس جانا بالکل جائز ہے،

روزوں کے لیے رمضان کا مہینا خاص کیا گیا ہے، اس لیے جو شخص اس مہینے میں موجود ہو، اس پر فرض ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے،

بیماری یا سفر کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کے باعث آدمی اگر رمضان کے روزے پورے نہ کر سکے تو لازم ہے کہ دوسرے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دنوں میں روزے رکھ کر اس کی تلافی کرے اور یہ تعداد پوری کر دے،

روزے کا منتہاے کمال اعتکاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کو اس کی توفیق دے تو اسے چاہیے کہ روزوں کے مہینے میں جتنے دنوں کے لیے ممکن ہو، دنیا سے الگ ہو کر اللہ کی عبادت کے لیے مسجد میں گوشہ نشین ہو جائے اور بغیر کسی ناگزیر انسانی ضرورت کے مسجد سے باہر نہ نکلے،

آدمی اعتکاف کے لیے بیٹھا ہو تو روزے کی راتوں میں کھانے پینے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن بیویوں کے پاس جانا اس کے لیے جائز نہیں رہتا۔ اعتکاف کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔

روزے کا یہ قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہے اور قرآن مجید نے بھی بڑی حد تک اس کی تفصیل کر دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل سے اس کی جو توضیحات ہوئی ہیں، وہ ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ہم ذیل میں بیان کیے دیتے ہیں:

۱۔ رمضان کی ابتدا بھی چاند دیکھنے سے ہونی چاہیے اور اس کا خاتمہ بھی اسی پر ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور اسے دیکھ کر افطار کرو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کر لو۔[۳۷۳]

۲۔ رمضان کے شروع ہونے سے ایک یا دو دن پہلے روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند نہیں کیا اور فرمایا ہے کہ وہ شخص، البتہ اس سے مستثنیٰ ہے جو روزے ہی رکھتا ہو۔[۳۷۴]

۳۔ سحری کے لیے اٹھنا چاہیے۔ فرمایا ہے کہ سحری کھایا کرو، اس لیے کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔[۳۷۵]

۴۔ اذان ہو جائے اور برتن ہاتھ میں ہو تو آدمی جو کچھ کھا رہا ہو، کھا لے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۳۷۶]

۵۔ روزے میں مجامعت کے سوا بیوی سے ہر طرح اظہار محبت کر سکتے ہیں۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں بوسہ لیتے اور مجھے اپنے ساتھ بھی لگاتے تھے۔[۳۷۷]

۶۔ جنابت کی حالت میں روزہ رکھ سکتے ہیں۔ سیدہ ہی کی روایت ہے کہ حضور بھی بعض اوقات روزہ رکھ لیتے اور فجر کے بعد ہی غسل جنابت کرتے تھے۔[۳۷۸]

۳۷۳؎ بخاری، رقم ۱۸۱۰۔ مسلم، رقم ۱۰۸۱۔

۳۷۴؎ مسلم، رقم ۱۰۸۲۔

۳۷۵؎ بخاری، رقم ۱۸۲۳۔ مسلم، رقم ۱۰۹۶۔

۳۷۶؎ ابوداؤد، رقم ۲۳۵۰۔

۳۷۷؎ بخاری، رقم ۱۸۲۶۔ مسلم، رقم ۱۱۰۶۔

۳۷۸؎ بخاری، رقم ۱۸۲۹۔ مسلم، رقم ۱۱۰۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۷۔ آدمی بھول کر کچھ کھا لے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ فرمایا ہے کہ یہ تو اسے اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے۔[۳۷۹]

۸۔ اعتکاف کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ ہے کہ رمضان کے آخری عشرے میں روزہ رکھ کر اور کسی جامع مسجد میں بیٹھنا چاہیے۔ سیدہ کی روایت ہے کہ اعتکاف کرنے والا نہ بیمار کی عیادت کرے، نہ جنازے کے لیے جائے، نہ بیوی کے قریب ہو اور نہ کسی ناگزیر انسانی ضرورت کے سوا مسجد سے نکلے۔[۳۸۰]

۹۔ جان بوجھ کر روزہ توڑ لینا ایک بڑا گناہ ہے۔ اس طرح کی کوئی چیز آدمی سے سرزد ہو جائے تو بہتر ہے کہ وہ اس کا کفارہ ادا کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے ایک شخص کو وہی کفارہ بتایا جو قرآن مجید نے ظہار کے لیے مقرر کیا ہے۔ تاہم روایت سے واضح ہے کہ جب اس نے معذوری ظاہر کی تو آپ نے اس پر اصرار نہیں فرمایا۔[۳۸۱]

۱۰۔ روزہ کھولنے کی جو دعا آپ سے منقول ہے، وہ یہ ہے:

ذهب الظمأ، وابتلت العروق، وثبت الاجر، إن شاء الله تعالىٰ۔[۳۸۲]

''پیاس جاتی رہی، رگیں تر ہو گئیں اور اللہ نے چاہا تو اس کا اجر بھی اس کے ہاں ثابت ہو گیا۔''

[باقی]

---

[۳۷۹] بخاری، رقم ۱۸۳۱۔ مسلم، رقم ۱۱۵۵۔

[۳۸۰] بخاری، رقم ۱۹۲۱۔ مسلم، رقم ۱۱۷۱۔ ابوداؤد، رقم ۲۴۷۳۔

[۳۸۱] بخاری، رقم ۱۸۳۴۔ مسلم، رقم ۱۱۱۱۔

[۳۸۲] ابوداؤد، رقم ۲۳۵۷۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

غیرت کا قتل

ہمارے معاشرے میں عزت کے لیے قتل کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ بطور خاص دیہی معاشرے میں ایسے مواقع پر قتل نہ کر سکنے والوں کو غیرت مند نہیں سمجھا جاتا اور انھیں مختلف قسم کے طعنوں کا ہدف بننا پڑتا ہے۔ غیرت کے لیے قتل کرنے والے جب قانون کی گرفت میں آتے ہیں تو معاشرہ انھیں ہمدردی کی نظر سے دیکھتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ قانون بھی ان کے ساتھ رعایت کا معاملہ کرے گا۔

ہمیں معلوم ہے کہ تقریباً تمام معاشرے قبائلی اور جاگیردارانہ سماج سے موجودہ شکل میں آئے ہیں۔ معاشرہ اپنی ان حالتوں میں جرائم کی بیخ کنی کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا رہا ہے۔ مزید یہ کہ ایسے معاشروں میں ان چھوٹی اکائیوں کو جرائم کی سزائیں خود ہی مقرر کرنے اور انھیں نافذ کرنے کا اختیار حاصل رہا ہے۔ جس کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے جرائم پر انتہائی اذیت ناک یا موت کی سزا بھی دی جاتی رہی ہے۔ ہر معاشرہ جرائم سے نمٹنے کے لیے دو سطح پر تدابیر کرتا ہے۔ ایک سطح قانون کی ہے۔ یعنی معاشرہ ایسے قانون، ضابطے اور ادارے بناتا ہے جن کے ذریعے سے وہ مجرمین کو پکڑتا اور سزائیں دیتا ہے۔ دوسری سطح اقدار اور روایات کی ہے۔ یعنی معاشرہ اپنی پسند اور ناپسند کو اجتماعی نفسیات بنا دیتا ہے اور اپنے افراد کو اس سے انحراف کرنے پر ہدف طعن و ملامت بناتا ہے۔ ہر انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ساتھ کسی برائی یا کم تر بات کی نسبت گوارا نہیں کرتا۔ انسان کی اس فطرت کے مختلف پہلوؤں کو حیا، شرم اور غیرت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ جذبہ جہاں معاشرے کو جرائم سے پاک رکھنے میں ایک مثبت کردار ادا کرتا ہے وہاں اس کے بے محل اظہار سے ظلم و ستم بھی وجود میں آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال زنا کے بارے میں غیرت کا تصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دین کی رو سے مرد کے زنا اور عورت کے زنا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جتنا گناہ گار مرد ہوگا اتنی ہی گناہ گار عورت ہوگی۔ حتیٰ کہ ہمارے دین میں اس جرم کی دنیوی سزا بھی ایک ہی رکھی گئی ہے۔ یعنی مرد کی سزا بھی سو کوڑے ہے اور عورت کی سزا بھی سو کوڑے ہے۔ اگر کسی پاک دامن مرد کو کسی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بے کردار عورت سے شادی سے روک دیا گیا ہے تو اسی طرح کسی پاک دامن عورت کو بھی کو کسی زانی مرد سے شادی سے روک دیا گیا ہے۔ سورۂ نور میں ہے:

اَلزَّانِیُ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً أَوْ مُشْرِکَةً وَالزَّانِیَةُ لَا یَنْکِحُهَآ إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ. (۲۴: ۳)

''زانی نہ نکاح کرنے پائے، مگر کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور کسی زانیہ سے نکاح نہ کرے، مگر کوئی زانی یا مشرک اور اہل ایمان پر یہ چیز حرام ٹھیرائی گئی ہے۔''

لیکن مسلم معاشروں میں بھی قرآن مجید کی اس واضح ہدایت اور قانون سازی کے باوجود عورت کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اسے اسلامی معاشرے کی قدر سمجھا جاتا اور اسی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ نبوی مذاہب میں اللہ تعالیٰ نے عزت، مال اور جان کے خلاف جرائم کی سزائیں اور اسی طرح حکومت کے حقوق خود مقرر کر کے ہر دور میں انسانی سماج کو ضروری رہنمائی دی ہے تاکہ اسے اس معاملے میں افراط وتفریط سے بچایا جا سکے۔

ان تعلیمات کی روشنی میں غیرت کے قتل کی قباحت کو دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ یہ قتل غیر ریاستی یا ڈھیلے ریاستی سماج کا مظہر ہے۔ ہم ایک منظّم اور منضبط معاشرہ ہیں۔ دنیا کا کوئی منظّم معاشرہ یہ بات درست قرار نہیں دے گا کہ جب اجتماعی نظام کے تحت کوئی ضابطہ بنا دیا گیا ہے تو اسے غیر موثر کیا جائے یا اس کی خلاف ورزی کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی منظّم معاشرے میں جب کوئی فرد یا گروہ کسی مجرم کو خود سزا دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس معاشرے کے نظم کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس روش کو کسی بھی سطح پر درست قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس روش کی حوصلہ افزائی کرنے والے تمام عناصر کی اصلاح ضروری ہے۔ ہمارے ہاں ریاستی نظام پر عدم اطمینان کے اظہار کی یہ صورت بہت عام ہوتی جا رہی ہے کہ ہم نظام سے بالا بالا معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق انجام دینے لگ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ کام وہ بھی کر رہے ہوتے ہیں جو کسی نظام کا حصہ یا اس نظام کے خالق ہوں۔ اس پہلو سے دیکھیے تو غیرت کا قتل اسی روش کی انتہائی ناپسندیدہ مثال ہے۔ اسلام نے اس روش کو کس درجہ ناپسند کیا ہے اس کا بہت واضح اظہار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ہوتا ہے:

عن ابن عباس عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: من کرہ من امیرہ شیئا، فلیصبر. فانہ من خرج من السلطان شبرا مات میتة جاھلیة. (بخاری، رقم ۶۵۳۰)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جسے اپنے حکمران کا کوئی اقدام ناپسند ہو، اسے چاہیے کہ وہ صبر کرے۔ اس لیے کہ جو نظام حکومت سے بالشت برابر بھی نکلا وہ ایسے ہی مرا جیسا زمانۂ جاہلیت میں مرجاتا ہے۔''

مسلمانوں میں اس تعلیم کو بہت عام کرنے کی ضرورت ہے۔ قتل کا انتقام خود لینا، اسلام کے دشمنوں کو ذاتی سطح پر نشانہ

بنانا، خلاف اسلام اعمال کے خلاف جتھا بندی کرنا اور اسی طرح غیرت میں آ کر قتل کرنا، یہ سب نظام اجتماعی سے انحراف کی مثالیں ہیں اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عدم ایمان کا مظہر ہیں۔

سطور بالا میں ہم نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کسی روش کو گوارا نہیں کرتا، بلکہ اس کے نزدیک یہ روش منافی ایمان ہے۔ اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور یہ بات واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک قتل کس جرم کی سزا ہے اور زنا پر کیا سزا دی جائے گی۔ مزید براں یہ کہ اگر کسی شخص کی بیوی یہ جرم کرے اور اس کے پاس خود اس کی اپنی ذات کے علاوہ کوئی گواہ نہ ہو یا ضروری گواہی موجود نہ ہو تو کیا اقدام کیا جائے گا۔

اسلام میں موت کی سزا صرف دو جرموں پر رکھی گئی ہے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف مقدمات کے فیصلوں سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی واضح ہدایت قرآن مجید کی آیت کی صورت میں موجود ہے۔ مزید یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے مجرموں کو سزائے موت دی ہے، قرآن مجید میں بیان کیے گئے اسی ضابطے کے تحت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مِنْ أَجْلِ ذَٰلِكَ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَاءِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَآ أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا. (المائدہ ۵:۳۲)

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لازم کر دیا تھا کہ جس کسی نے کسی کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا تو گویا سب کو بچایا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مراد یہ ہے کہ کسی جان کو لینے کی اجازت خدا کی شریعت میں ہمیشہ دو ہی صورتوں میں حاصل رہی ہے۔ ایک یہ کہ قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے اور دوسرے یہ کہ ایسے شخص کو سزائے موت دی جائے جو ریاست کے نظم اجتماعی کے لیے خطرہ بن گیا ہو۔ اگر کسی شخص نے یہ جرم نہیں کیے اور اسے قتل کیا گیا تو اس کی سزا اللہ کے نزدیک ابدی جہنم ہے۔

ارشاد ہے:

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَأَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيمًا. (النساء ۴:۹۳)

''اور جو کوئی کسی مسلمان کو عمداً قتل کرے گا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ زنا پر اسلام میں کیا سزا دی گئی ہے۔ یہ سزا، مرد ہو یا عورت سو کوڑے اور ہمیشہ کے لیے کسی پاک دامن سے شادی پر پابندی ہے۔ اسی طرح کسی پر اگر تہمت لگا دی جائے تو اس پر اسی کوڑے کی سزا رکھی گئی ہے۔ یہاں یہ

بات واضح رہے کہ یہ سب اس صورت میں ہوگا جب مقدمہ دائر کیا جائے گا اور جرم ثابت ہو جائے گا۔ عمومی طور پر مسلمانوں کو یہ اخلاقیات سکھائی گئی ہے کہ وہ پردہ پوشی کریں اور تربیت و اصلاح کی روش اختیار کریں۔ یہ جرم بیٹی نے کیا ہو، بہن نے کیا ہو، بیٹے نے کیا ہو، بھائی نے کیا ہو، بیوی نے کیا ہو، یا شوہر نے کیا ہو، سب کی سزا یہی ہے۔ یہ سزا بھی نظم اجتماعی کے تحت جرم ثابت ہونے پر دی جائے گی۔ یہ سزا یا کوئی دوسری سزا انفرادی طور پر اگر دی گئی تو یہ بھی ایک جرم ہے، جس پر قانون کے مطابق کارروائی ہونی چاہیے۔ اس معاملے میں یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر واضح کی ہے۔ ہلال بن امیہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کے شریک بن سحماء سے ملوث ہونے کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: گواہی لاؤ ورنہ تمھیں قذف کی سزا بھگتنا ہوگی۔ ہلال نے نے کہا: آدمی اپنی آنکھ سے دیکھے پھر بھی اسے گواہ لانے ہوں گے۔ اس پر آپ نے لعان کے قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کی ہدایت فرمائی[1]۔ اسی طرح سعد بن عبادہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایسا کرتے دیکھے تو قتل کر دے۔ آپ نے فرمایا: نہیں[2]۔

غرض یہ کہ میاں بیوی کے رشتے میں جب یہ صورت پیش آئے تو ان کے لیے اسلامی قانون میں یہ راستہ رکھا گیا ہے کہ وہ لعان کا طریقہ اختیار کریں۔ یہ قانون یہ بات بالکل واضح کر دیتا ہے کہ شوہر کے لیے اس کے علاوہ کوئی کارروائی جائز نہیں کہ وہ عدالت میں آئے اور لعان کا طریقہ اختیار کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی ایک معاہدہ ہے۔ معاہدے کے کسی فریق کی طرف سے اس کی خلاف ورزی کی اس کے علاوہ کوئی اور سزا نہیں ہو سکتی کہ معاہدہ توڑ دیا جائے اور یہ حق صرف مرد ہی کو نہیں عورت کو بھی حاصل ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

1۔ بخاری، رقم ۴۷۴۵۔
2۔ مسلم، رقم ۲۷۵۲۔

محمد رفیع مفتی

''تصویر کا مسئلہ''

''محدث'' کے اعتراضات کا جائزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہماری کتاب ''تصویر کا مسئلہ'' ایک عرصے سے منظر عام پر آ چکی ہے۔اس میں ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ نقطۂ نظر درست نہیں ہے کہ جان دار کی تصویر ناجائز ہے اور بے جان کی جائز ہے۔صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر وہ تصویر ناجائز ہے، جو کسی بھی درجے میں مظہر شرک ہے، یہی بات قرآن مجید کی واضح رہنمائی سے ہمارے سامنے آتی ہے اور یہی احادیث صحیحہ سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے،صحابہ اور تابعین کا فہم بھی یہی حکم لگاتا اور ان کا عمل بھی اسی کے مطابق دکھائی دیتا ہے۔اس خاص (مشرکانہ) نوعیت کی تصاویر کے علاوہ جتنی تصاویر بھی ہیں، قرآن وحدیث میں تصویر کے بارے میں دی گئی رہنمائی، ان سے متعلق ہی نہیں ہے۔چنانچہ اس بنا پر جان دار کی تصویر کو علی الاطلاق ناجائز قرار دینا شریعت کے منشا کے خلاف ہے۔

ماہنامہ ''محدث''، مارچ ۲۰۰۴ کے شمارے میں محترم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدنی نے ''تصویر کا مسئلہ'' پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں کتاب کے اصل استدلال اور بنیادی مباحث سے تو اعتنا نہیں برتا، البتہ بعض ضمنی مباحث کو ہدف تنقید بنایا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ان کا خلاصہ ہمارے جوابات کے ساتھ درج ذیل ہے:

پہلی تنقید کرتے ہوئے، مولانا مدنی صاحب نے ہماری عبارت کا درج ذیل حصہ نقل کیا ہے:

> ''یہ مؤحدین حواس کی گرفت میں نہ آنے والے، یعنی نہ دکھائی دینے والے اور نہ محسوس ہو سکنے والے خدا کو مانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ اس کے قائل ہی نہیں تھے کہ خدا کو متصور کرنا ممکن بھی ہے اور اسے حواس کی گرفت میں لایا بھی جا سکتا ہے تو پھر وہ اس کی شبیہ کیسے بنا سکتے تھے؟'' (تصویر کا مسئلہ، ۸۶)

اس پر تنقید کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

''مذکورہ بالا عبارت میں وہ اعتزالی عقائد کے زیر اثر دنیا و آخرت میں مطلقاً دیدار الٰہی کا انکار کر کے اپنے طور پر مشبہہ کا رد کر رہے ہیں، حالانکہ یہ عقیدہ جہمیہ معطلہ کا ہے۔ جبکہ حق مشبہ اور معطلہ کے درمیان ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔''

(محدث، شمارہ مارچ ۲۰۰۴، ۶۴)

ہماری عبارت اپنے لفظوں سے بھی واضح تھی اور اس کا سیاق وسباق بھی اسی پر دلالت کرتا تھا کہ اس میں موحدین کے اللہ کی تصویریں نہ بنانے اور ان کے شبیہیں نہ ڈھالنے کے حوالے سے صرف یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ انھوں نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ ہم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تصویر چونکہ شکل وصورت کی نقل ہوتی ہے اور اللہ کی شکل وصورت کسی انسان نے دیکھی ہی نہیں، لہٰذا، وہ لوگ اللہ کی تصویریں کیسے بنا سکتے تھے؟

لیکن بڑی حیرانی کی بات ہے کہ مولانا محترم نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مصنف دنیا و آخرت میں مطلقاً دیدار الٰہی کا منکر ہے۔ بخدا یہ ہمارے اوپر بہتان ہے۔ ان دو باتوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ مولانا ''مشبہ'' اور ''معطلہ'' جن دو کلامی گروہوں کے نظریات سے ہمیں منسوب کرنا چاہتے ہیں، ان کے نظریات سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔

دیدارِ الٰہی سے متعلق ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مؤمنین کو آخرت میں اس نعمت سے نوازا جائے گا، جیسا کہ بخاری کی حدیث میں بیان ہوا ہے:

انکم سترون ربکم. (بخاری، رقم ۵۷۳) ''تم عنقریب اپنے رب کو دیکھو گے۔''

البتہ یہ خدا کو دیکھنا امور متشابہات میں سے ہے، دنیا میں ہم اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتے۔ ان سب معاملات میں ہم امام مالک رحمہ اللہ کے اس موقف کے قائل ہیں جو انھوں نے قرآن کی آیت 'الرحمن علی العرش استواء' پر گفتگو کے دوران میں 'استواء' کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے، بیان فرمایا تھا:

الاستواء معلوم والکیف مجھول والایمان به واجب والسؤال عنه بدعة. (تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۰۹)

''(خدا کا عرش پر) تمکن معلوم ہے، اس کی کیفیت غیر معلوم ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔''

ہماری اس تحریر سے یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہاں ''نہ دکھائی دینے والے اور نہ محسوس ہونے والے خدا'' کے الفاظ سے خدا میں مخلوق جیسی دکھائی دینے اور محسوس ہونے کی صفات پائے جانے کی نفی مقصود ہے، ان الفاظ کا ''مشبہ'' و ''معطلہ'' کلامی گروہوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سیاق وسباق اس معاملے میں بالکل واضح ہے، لیکن معلوم نہیں کہ مولانا کو اس میں کیوں اشکال محسوس ہوا۔

اپنی دوسری تنقید کے حوالے سے انھوں نے ہماری عبارت کا درج ذیل حصہ نقل کیا ہے:

''تماثیل اگر شر ہیں تو ہمیشہ کے لیے ہیں اور اگر خیر ہیں تو ہمیشہ کے لیے ہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ ایک شریعت میں جائز

ہوں اور ایک میں ناجائز۔'' (تصویر مسئلہ، ۲۳)

اس پر تنقید کرتے ہوئے مولانا مدنی صاحب نے سجدۂ تعظیمی کی مثال دی ہے کہ وہ پہلی شریعتوں میں جائز تھا اور ہماری شریعت میں حرام ہے۔ چنانچہ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تماثیل ایک شریعت میں جائز اور دوسری میں ناجائز ہوسکتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''غامدی فکر کی بڑی اساس اسرائیلیات (بائیبل وغیرہ) ہیں جسے وہ 'حدیث رسول' پر مقدم رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ بہت سے مسائل میں سابقہ شرائع کے تنوع کے قائل نہیں۔ جبکہ محمدی شریعت میں ایسے کئی مسائل موجود ہیں جو کسی سابقہ شریعت میں جائز ہونے کے باوجود آخری اور اکمل حکم کے طور پر ناجائز قرار پائے۔ مثلاً سجدۂ تعظیمی جو فرشتوں سے آدم کو کروایا گیا اور حضرت یوسف کو ان کے ماں باپ سمیت تمام بھائیوں نے کیا، لیکن شریعت محمدیہ میں یہ سجدۂ تعظیمی ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے دیا گیا۔'' (محدث، شمارہ مارچ ۲۰۰۴، ۶۴)

ہمارا خیال اس سے مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر تماثیل کی حرمت ان میں کسی ابدی شر کے پائے جانے کی وجہ سے ہے، تو پھر ایسا ممکن نہیں کہ یہ تماثیل ایک شریعت میں جائز اور دوسری میں ناجائز ہوں، چونکہ احادیث میں تماثیل کی حرمت کی وجہ شرک بتائی گئی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ایسی تماثیل ہر شریعت ہی میں ناجائز ہوں۔ کوئی مشرکانہ چیز کسی شریعت میں کیسے جائز ہوسکتی ہے، جب کہ پروردگار نے فرمادیا ہے:

وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ''اور تیرے رب کا یہ فیصلہ ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔'' (الاسراء ۱۷: ۲۳)

اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ آخری شریعت نازل کرتے وقت نہیں کیا، بلکہ قرآن مجید سے پتا چلتا ہے کہ ہر نبی اور رسول نے آکر اسی توحید کی بات کی ہے اور اس توحید ہی کی بنا پر اپنی قوم کی مشرکانہ تماثیل کی مخالفت کی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کے معاملے کو دیکھیں جو یہود و نصاریٰ اور مسلمان، تینوں امتوں کے جد امجد ہیں، انھوں نے اپنی قوم کے معبد میں موجود وہ تماثیل توڑ دیں جو دین شرک کا مظہر تھیں، یعنی ان کی شریعت میں بھی یہ تماثیل جائز نہ تھیں۔

بہر حال یہ بات ہماری عبارت کے الفاظ اور سیاق و سباق سے پوری طرح واضح تھی۔ اس حصے سے متعلق پیراگراف میں ہم نے بڑے سادہ اور صاف الفاظ میں ان تماثیل کا ذکر کیا ہے، جنھیں بنانا اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت خلاقی میں مداخلت قرار دیا ہے اور جن کے بارے میں حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ انھیں وجود میں لانا خدا کی تخلیق سے مشابہ تخلیق کرنے کا دعویٰ ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول، قال عز و جل: ومن اظلم ممن ذهب يخلق خلقا كخلقي. (مسلم، رقم ۲۱۱۱)

''اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو میرے تخلیق کرنے کی طرح تخلیق کرنے نکل کھڑا ہوا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس حدیث میں جن لوگوں کو ظالم کہا گیا ہے ان کا ظلم یہی تھا کہ وہ خدا کی تخلیق جیسی تخلیق کرنے کے مقام پر کھڑے تھے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ خدا کی تخلیق کی یہ نقل کسی شریعت میں درست ہو اور کسی میں غلط، کسی میں حلال ہو اور کسی میں حرام۔ ہمارے نزدیک یہ کام سرتاسر ابدی حرمت کا کام ہے، یہ کسی بھی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتا۔

اس وضاحت کے بعد اب ہم اپنے اس جملے کا وہ سیاق و سباق بیان کرتے ہیں، جس پر اگر مولانا کی نگاہ پڑ جاتی تو شاید ہمیں اس ساری درازنفسی کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

زیر بحث جملہ متن کتاب میں اپنے سیاق و سباق کے ساتھ اس طرح سے ہے:

''تماثیل کی مناہی کی جو علت بیان کی گئی ہے، وہ خدا کی تخلیق سے اس کی مشابہت ہے۔ یہ مشابہت ایسی چیز ہے کہ یہ کسی صورت میں بھی تمثال سے مفقود نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے مفقود ہوتے ہی تمثال، تمثال نہیں رہتی۔ لہٰذا، تماثیل اگر شر ہیں، تو ہمیشہ کے لیے ہیں اور اگر خیر ہیں تو ہمیشہ کے لیے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک شریعت میں جائز ہوں اور ایک میں ناجائز۔ شرائع کے مابین اختلاف اِس نوعیت کا نہیں رہا کہ ایک میں کسی حقیقی شر کو خیر قرار دے دیا گیا ہو اور دوسری میں کسی حقیقی خیر کو شر قرار دے دیا گیا ہو۔

مزید برآں آپ یہ دیکھیں کہ حدیث میں فرشتوں کے بارے میں ہمیں یہ خبر دی گئی ہے کہ وہ تصویر والے گھر میں داخل نہیں ہوتے۔ فرشتوں کا یہ اپنا طریقہ ہے، اُنھوں نے یہ شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول کے بعد اختیار نہیں کیا تھا۔ اب بتائیے کیا فرشتے سلیمان علیہ السلام کے اس دربار میں نہ جایا کرتے تھے، جس میں تماثیل تھیں؟'' (تصویر کا مسئلہ، ۲۳)

اس کے بعد تماثیل کی ابدی حرمت کے اسی پہلو کو حاشیے میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

''تماثیل کی ممانعت کی جو علت بیان کی گئی ہے، وہ ان کا ''خدا کی تخلیق سے مشابہ تخلیق'' ہونا ہے۔ یہ علت ایسی ہے کہ یہ کسی صورت بھی تماثیل سے مفقود نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا، یہ فی نفسہٖ اگر شر ہیں، تو ہمیشہ کے لیے ہیں اور اگر فی نفسہٖ خیر ہیں تو ہمیشہ کے لیے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک شریعت میں جائز ہوں اور ایک میں ناجائز۔ شریعتوں کے مابین قانون کا جو اختلاف ہے، اس کی بنا کسی شر کے خیر قرار دیے جانے اور کسی خیر کے شر قرار دیے جانے پر نہیں ہوتی، بلکہ وہ معاشرتی اور تمدنی حالات کے مختلف ہونے کی بنا پر ہوتی ہے۔ ہر شریعت میں خیر ہی کو خیر اور شر ہی کو شر قرار دیا گیا ہے۔

شرائع کے اختلاف کی ایک نوعیت یہ بھی ہوتی ہے کہ سزا کے طور پر کسی قوم کو کچھ وقت کے لیے کسی خیر سے فائدہ اٹھانے سے روک دیا جائے یا سدِ ذریعہ کے طور پر کسی مباح شے کو ممنوع قرار دے دیا جائے، لیکن ان صورتوں میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ خدا اپنی شریعت میں سے کسی خیر کو شر اور کسی شر کو خیر قرار دے دے۔'' (تصویر کا مسئلہ، ۲۸)

اپنے مدعا کی اس مزید وضاحت کے بعد اب ہم مولانا کے پیش کردہ ''سجدۂ تعظیمی'' کے استدلال کو لیتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

''محمدی شریعت میں ایسے کئی مسائل موجود ہیں جو کسی سابقہ شریعت میں جائز ہونے کے باوجود آخری اور اکمل حکم کے طور

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پر ناجائز قرار پائے۔ مثلاً سجدۂ تعظیمی جو فرشتوں سے آدم کو کرایا گیا اور حضرت یوسف کو ان کے ماں باپ سمیت تمام بھائیوں نے کیا، لیکن شریعت محمدیہ میں یہ سجدۂ تعظیمی ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے دیا گیا۔'' (محدث، مارچ ۲۰۰۴، ۶۴)

مولانا کا یہ استدلال سراسر غلط ہے۔ اس کی غلطی واضح کرنے کے لیے ہم مولانا سے دو سوال پوچھنا چاہتے ہیں:

۱۔ کیا مولانا یہ سمجھتے ہیں کہ اس درج بالا اصول ہی کے تحت کسی شریعت میں مشرکانہ تماثیل جائز بھی ہو سکتی ہیں؟

۲۔ کیا سجدۂ تعظیمی وہ مشرکانہ عمل ہے جو پرانی شریعتوں میں جائز تھا، لیکن آخری شریعت میں اسے حرام قرار دے دیا گیا؟

اگر مولانا ان دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں دیتے ہیں تو ان کے لیے صحیح عقائد کے بے شمار مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر وہ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں تو پھر ہمارے خلاف ان کا استدلال بے معنی ہو جاتا ہے۔

بہر حال، اس معاملے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کوئی بھی حقیقی حرمت والا عمل (مثلاً کوئی مشرکانہ یا کافرانہ عمل) کسی شریعت میں کبھی جائز نہیں رہا۔ چنانچہ غیر اللہ کے لیے سجدۂ عبادت جس کی حقیقت غیر اللہ کی عبادت کرنا ہے، یہ ہر شریعت میں ہمیشہ سے ممنوع رہا ہے اور سجدۂ تعظیمی جس کی حقیقت محض تعظیم کرنا اور آداب بجالانا تھا، یہ پہلی شریعتوں میں جائز رہا ہے، البتہ آخری شریعت میں اسے بھی سجدۂ عبادت کے ساتھ ظاہری مماثلت کی بنا پر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اگر ان دونوں میں کوئی حقیقی مماثلت ہوتی تو لازماً سجدۂ تعظیمی بھی سب شریعتوں میں ممنوع ہوتا۔

ہماری کتاب پر مولانا تیسری تنقید کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں:

''اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مفتی صاحب کا یہ موقف درست ہے کہ تصویر قبیح لعینہ یعنی فی نفسہ حرام نہیں، جیسا کہ ان کے سارے دلائل اسی کے گرد گھوم رہے ہیں، تو قبیح لغیرہ ضرور ہے۔'' (محدث، مارچ ۲۰۰۴، ۶۵)

چنانچہ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہمارا نقطۂ نظر ادھورا ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مولانا کی یہ تنقید بھی درست نہیں ہے، کیونکہ ہم نے تصویر کے قبیح لعینہ نہ ہونے اور قبیح لغیرہ ہونے، دونوں ہی کو بیان کیا ہے۔ قبیح لعینہ نہ ہونے کے دلائل سے کتاب بھری پڑی ہے اور اس کے ساتھ ہی پوری کتاب میں جگہ جگہ تصویر کے قبیح لغیرہ ہونے کو بیان کیا گیا ہے، کاش ان پر مولانا کی نگاہ پڑ جاتی۔ ذیل میں ہم اس سے متعلق اقتباسات نقل کیے دیتے ہیں:

o ''فنون لطیفہ کے استعمال کی تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انسان انھیں کسی جرم اور شر کے لیے استعمال کرے یا ان سے شیطان کی اطاعت اور اس کی خدمت اس کے پیش نظر ہو۔ ظاہر ہے دین فنون لطیفہ کے اس استعمال کو گوارا نہیں کر سکتا۔

چنانچہ جب تصاویر و تماثیل ایمان اور اخلاق کی بربادی کا ذریعہ بن جائیں، آلات موسیقی شیطان کی خدمت کا وسیلہ قرار پائیں، عمارات کی شان و شوکت طبیعت کی سرکشی کا باعث بنے، شعر و شاعری حق اور باطل کی تمیز کیے بغیر ہر وادی میں سرگردانی کی راہ بن جائے، تو مذہب ان پر قدغن لگاتا ہے، پھر کسی کو وہ حرام اور کسی کو مکروہ قرار دیتا ہے۔

مذہب فنون لطیفہ کو فی نفسہ پسند کرتا ہے، جب تک یہ اس کی بربادی پر آمادہ نہ ہوں۔ جب یہ اس کی جڑیں کھودنا اور اسے

برباد کرنا چاہیں، تو پھر یہ ان پر گرفت کرتا ہے''۔(۸۳)

o ''ہاں یہ بات الگ سے درست ہے کہ وہ تمام تصاویر جن کے اندر شرک کے علاوہ کوئی اور دینی یا اخلاقی خرابی پائی جائے گی، وہ بھی دینی طور پر بالکل ممنوع ہوں گی''۔(۷۵)

o ''خدا کا دین تصویر بنانے کو صرف اور صرف اُسی وقت ممنوع قرار دیتا ہے، جب اُس میں دینی یا اخلاقی اعتبار سے کوئی خرابی پائی جاتی ہو''۔(۷۵)

o ''تصویر کے بارے میں قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی کی رہنمائی سے یہ بات تو کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ مذہب کا تصویر و تمثال پر اعتراض صرف اور صرف کسی دینی یا اخلاقی خرابی ہی کی بنا پر ہے، ورنہ اُسے ان چیزوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا۔ چنانچہ نقاشی، مصوری، فوٹو گرافی اور مجسمہ سازی میں سے جو چیز بھی کسی دینی یا اخلاقی خرابی کا باعث بنے گی، وہ اُس خاص حوالے سے ممنوع قرار پائے گی۔ ہاں ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کے بارے میں یہ خدشہ ہو کہ وہ کسی خرابی کی طرف لے جانے کا ذریعہ بن سکتی ہے، جیسے کسی خاص علاقے میں اور کسی خاص دور میں یہ مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مجسمہ سازی شرک کی طرف رغبت کا ذریعہ بننے لگی ہے، تو اِس صورت میں مجسمہ سازی کو 'سداً للذریعة' ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ممانعت بس اس خاص علاقے میں، اُس خاص دور تک اور اُس خاص خرابی کی حد تک ہی ہو گی۔

بعض علما کا خیال ہے کہ آج بھی مجسمہ اور شرک ایسے ہی ہیں جیسے جسم اور روح، ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے، لیکن اگر اسے درست مانا جائے تو پھر ظاہر ہے کہ مجسمہ سازی ہمیشہ کے لیے ممنوع ہو گی۔

اسی طرح اگر کسی موقع پر کسی خاص نوعیت کی تصاویر بجائے خود درست ہونے کے باوجود کسی اخلاقی خرابی کا باعث بننے لگ جاتی ہیں، تو اس خاص نوعیت کی تصاویر کو بھی 'سداً للذریعة' ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔

لیکن فی نفسہٖ تصاویر کے بارے میں کسی اعتراض کی کیوں کر گنجایش ہو سکتی ہے، جب کہ خدا اور اس کے رسول نے انھیں جائز رکھا ہو۔ مسلمانوں کو اسی چیز پر اعتراض ہوتا ہے، جس پر اللہ اور اس کے رسول کو اعتراض ہو۔ چنانچہ نقاشی، مصوری، فوٹو گرافی اور مجسمہ سازی میں سے کوئی چیز بھی فی نفسہٖ ممنوع نہیں ہے۔ البتہ اگر ان میں خرابی کا کوئی عنصر شامل ہو جائے، تو الگ بات ہے۔ پھر مذہب اس کا سنجیدگی سے نوٹس لے گا۔

مقدس افراد یا اشیا کی تصاویر بنانے کے بارے میں قرآن و حدیث میں صریح الفاظ میں کوئی ممانعت نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا، اصولاً ایسی تصاویر کی حرمت کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ ان کے اندر پایا جانے والا تقدس چونکہ ان تصاویر کے مظہر شرک بننے کا باعث ہو سکتا ہے، لہٰذا، ہماری رائے میں عقیدت کے جذبے سے مقدس افراد یا اشیا کی تصاویر بنانا مکروہ کے درجے میں ہے۔ چنانچہ اس رائے کے مطابق عقیدت کے جذبے سے مثلاً بیت اللہ، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صالح شخص کی تصویر بنانا دینی اعتبار سے مکروہ عمل ہو گا۔ البتہ عقیدت کے جذبے سے ہٹ کر کسی ضرورت کے تحت ان کی تصاویر بنانا بھی بالکل جائز عمل ہو گا۔ مثلاً کسی آرکیٹیکٹ کا تعمیر کے لیے بیت اللہ کا نقشہ بنانا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کوئی مسلمان مصوری کا پیشہ اختیار کر سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سوال کا جواب بالکل سادہ ہے، یعنی یہ کہ وہ فن جس پر شرعاً کوئی اعتراض نہیں، جس سے سلیمان علیہ السلام نے فائدہ اٹھایا اور جس کا ذکر کرتے ہوئے، قرآن مجید، خدا کی آخری کتاب، نہ صرف یہ کہ کوئی تنقید نہیں کرتی، بلکہ سلیمان علیہ السلام کے اس فن سے فائدہ اٹھانے کو اللہ کا فضل کہتی ہے اور اِس پر انھیں خدا کا شکر بجالانے کا حکم دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ فن اپنے اندر ایسی شرافت رکھتا ہے کہ اُسے کوئی بھی مسلمان اختیار کرے۔ البتہ اِس فن سے وہ کیا کام لیتا ہے، یہ چیز وہ ہے جو اُس کی آخرت پر اثر انداز ہوگی۔ اِس سے وہ شیطان کے مقاصد پورے کرنے کا کام لیتا ہے تو یہ عمل اُسے شیطان کے ساتھیوں میں شامل کرنے کا باعث ہوگا اور شیطان کے ساتھ اُس کے حشر کا ذریعہ بنے گا اور اگر وہ اس سے خیر کے کام لیتا ہے تو یہ چیز اُس کے لیے اخروی اجر کا باعث ہوگی۔'' (۹۴۔۹۶)

مرزا آصف رسول

سورۂ ماعون

منظوم ترجمانی

رحیم ورحمان حق تعالیٰ کے اسم عالی سے ابتدا ہے
خدا کے اے محترم پیمبر!
خدا سے ناآشنا دلوں کو
رہ ہدایت دکھانے والے
انھیں قیامت کا ڈر سنا کر خدا کی جانب بلانے والے!
تو دیکھا تم نے اس آدمی کو؟
جو روز محشر سے منحرف ہے
جزا سزا کی وہ کیسے تکذیب کر رہا ہے؟
یہی تو ہے وہ
کہ اس کے در پر
ستم کا مارا یتیم کوئی
جب اپنی حاجت مٹانے آئے
تو یہ بخیل اتنا سنگدل ہے
نہ صرف اس کو یہ ٹالتا
بلکہ دھکے دے کر نکالتا ہے
نہ خود خدا ترس ہے یہ کافر
کہ بے نواؤں کا ہاتھ پکڑے
نہ دوسروں کو ابھارتا ہے
کہ بھوکے مسکین کو کھلائیں
کہ شاہراہ حیات پر جو
گرے پڑے ہیں، انھیں اٹھائیں
جو بے سہارا ہیں ان کو بڑھ کر
گلے لگائیں
خدا کے ہاں تو
یونہی جزا ہے
کہ تم جو طالب ہو مغفرت کے
تو دوسروں کو معاف کر دو
جو اپنی خفت مٹانا چاہو
تو عیب ان کے بھی صاف کر دو
چنانچہ ایسے نمازیوں کے لیے
تباہی ہے
دونوں عالم کی روسیاہی
جو اپنی اپنی نماز ہی سے
کچھ ایسی غفلت برت رہے ہیں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کہ جو عبادت کا مدعا ہے
نہ اس حقیقت کو جانتے ہیں
نہ اپنے کردار سے عبادت کی
اصل و غایت ہی مانتے ہیں
حرم میں ان کا
قیام و قعدہ، رکوع و سجدہ
یہ سب ریا ہے
کہ ان کا اپنی تجوریوں کو
خدا کی مخلوق کی
بھلائی میں وقف رکھنا تو اک طرف ہے
وہ گھر میں رکھنے کی
یا برتنے کی
عام چیزیں بھی روکتے ہیں
تو دیکھا تم نے اس آدمی کو؟
جو روز محشر سے منحرف ہے
جزا سزا کی وہ کیسے تکذیب کر رہا ہے؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com